اللہ

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ

اور میں نے جنات اور انسانوں کو اس کے سوا کسی اور کام کیلئے پیدا نہیں کیا کہ وہ میری عبادت (یعنی معرفت حاصل) کریں

لا الہ الا اللہ
محمد رسول اللہ

شاہراہِ معرفت

کتابچہ نمبر 8

اکابر بالخصوص مجددین رحمۃ اللہ علیہم کی تعلیمات کے تعارف کیلئے

حضرت سید شبیر احمد کاکاخیل دامت برکاتہم

مسترشد حضرت مولانا محمد اشرف سلیمانی رحمۃ اللہ علیہ

و خلیفہ مجاز دیگر اکابر رحمۃ اللہ علیہم

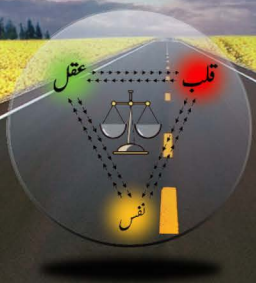

ناشر : خانقاہ رحمکاریہ امدادیہ راولپنڈی

حضرت مجدد الف ثانی حضرت کاکا صاحب حضرت شاہ ولی اللہ اور
حضرت شاہ اسماعیل شہید کے علوم شریعت،طریقت اور حقیقت(معرفت) سے
کتابچوں کا سلسلہ

شاہراہِ معرفت

کتابچہ نمبر8

(ربیع الاول۔ 1443ھ) بمطابق (حراء ۔1401 شمسی ہجری)
بمطابق (اکتوبر۔ 2022ء)

زیر سرپرستی

حضرت شیخ سید شبیر احمد کاکاخیل صاحب مدظلہٗ العالی

مقصد: اسلاف کی تحقیقات سے اُمَّت کو آجکل کی سمجھ میں آنے والی زبان میں روشناس کرنا

مجلس تحقیقات

زین العابدین صاحب مدظلہٗ

خانقاہ رحمکاریہ امدادیہ

مکان نمبر CB-1991/1 ۔بلمقابل جامع مسجد سیدنا امیر حمزہ
گلی نمبر4 ۔نزد آشیانہ چوک۔اللہ آباد ۔ویسرڈج 3 ۔راولپنڈی

فہرست مضامین

	عنوانات	
1	دیباچہ	2
2	یا اللہ	4
3	نعت رسول اکرم ﷺ	6
4	ربیعُ الاول	7
5	مطالعہ سیرت بصورت سوال	9
6	بیان جمعۃ المبارک	15
7	تعلیمات مجددیہ	33
7	مقامات قطبیہ ومقالات قدسیہ	73
8	مختصرات سلوک	98
9	خانقاہ کے شب و روز	102

دیباچہ

الحمد للہ شاہرائے معرفت کا آٹھواں شمارہ آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے قبول فرمائے اور قارئین کے لئے مفید بنائے۔ آمین۔

شمارۂ ہذا کا آغاز "مناجات" اور "نعت" پر مشتمل خوبصورت شعری کلام سے کیا گیا ہے۔

اِس شمارہ میں ماہِ ربیع الاوّل کی مناسبت سے ایک عارفانہ کلام جبکہ دو نثری مضامین شامل کئے گئے ہیں۔ پہلا مضمون ایک مقالہ ہے جس میں "نبی کریم ﷺ کی تاریخ پیدائش میں اختلاف" کے موضوع پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ جبکہ دوسرا مضمون حضرت سید شبیر احمد کاکا خیل صاحب دامت برکاتہم کا ایک خطبۂ جمعہ ہے جو حضرت نے "آپ ﷺ کی محبت کی اہمیت و ضرورت" کے موضوع پر ارشاد فرمایا تھا۔

جیسا کہ قارئین کو معلوم ہے کہ ہر شمارہ میں حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے مکتوبات میں سے منتخب مکتوب پیش کیا جاتا ہے۔ اِس شمارہ میں عقائد کی اہمیت پر لکھے جانے والے مکتوبات میں سے وہ مکتوب شامل کیا گیا ہے جس میں حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے عقائد کی تشریح فرمائی ہے۔ اس سلسلے میں عقیدہ نمبر 10 تا عقیدہ نمبر 19 پر مشتمل مکتوبات کا حصہ شامل کیا گیا ہے جس میں درج ذیل عقائد کی تشریح فرمائی گئی ہے:

1-قضا و قدر 2-جبر و اختیار

اہلِ ایمان کے ہمیشہ جنت میں رہنے اور کفار کے ہمیشہ جہنم میں محبوس رہنے کی وجوہات۔

انبیاءِ کرام کی بعثت سراپا رحمت ہے۔ ان ہستیوں کے بغیر ہماری ارتقا پذیر اور حوادث سے داغ دار عقل اللہ رب العزت کی معرفت، مرضیات اور نامرضیات کے

بارے میں ہر گز رہنمائی نہ کر سکتی اور نہ ہی تزکیہ و تصفیہ کی حقیقت میسر آتی۔

جنت میں اللہ تعالیٰ کی بے جہت و بے کیف رؤیت۔

اس کے علاوہ دوسرے بنیادی عقائد مثلاً قبر، حشر، میزان، جنت، دوزخ کے بارے بھی سیر حاصل بحث فرمائی ہے۔ نیز واضح فرمایا ہے کہ ان چیزوں پر دل سے ایمان لانے اور زبان سے اقرار کرنے کے ساتھ کفر اور کافری کے لوازم سے بیزاری کا اظہار کرنا بھی نہایت ضروری ہے۔

حضرت کاکا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیمات کے سلسلے میں، شمارۂ ہذا میں حضرت بابا حلیم گل رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب **"مقاماتِ قطبیہ و مقالاتِ قدسیہ"** کا درس نمبر 5 پیش کیا گیا ہے۔ اس میں اولیاء کرام کے مراتب بیان کرتے ہوئے اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ حضرت کاکا صاحب رحمۃ اللہ علیہ قطبِ حقیقی تھے۔ تجلیٔ ذات سے متحمل اور منور تھے اور نورِ ذات میں محو و فنا تھے۔ جو محو ہو جائے اس کو کیا خبر کہ وہ کون ہے اور کیا چیز ہے، اس کی زبان بند ہو جاتی ہے۔ اس حالت میں **"سُبْحَانِ ۔"** اور **"اَنَاالْحَق"** کہنا نا مناسب ہے اور ہر گز جائز نہیں۔ البتہ جو سالک تجلیٔ صفات میں مستغرق ہوتا ہے وہ صفات کے جمال کی وجہ سے اپنے آپ کو بھی انہی صفات میں موصوف دیکھتا ہے اور سالک کا وجود مجذوب ہو کر کلام کرنے لگ جاتا ہے، پس اہلِ ظاہر یہ کلام مجذوب کی جانب منسوب کر کے انہیں نقصان پہنچاتے ہیں۔

حضرت کاکا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مجاہدات کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ انہوں نے اپنے ایامِ طفولیت میں اتنی ریاضتیں، محنتیں اور مشقتیں اٹھائیں جو شمار اور گنتی سے باہر ہیں۔ جس کو ریاضت کی سعادت ہو جائے اسے ابدی نعمت اور سرمدی دولت نصیب ہو جاتی ہے۔

قارئین کرام سے گزارش ہے کہ شمارۂ ہذا کا بغور مطالعہ فرمائیں اور اپنی کیفیات و آراء سے مطلع فرمائیں۔ اللہ کریم ہماری کامل اصلاح فرمائے اور ہمیں دائمی رضا سے نوازے۔ آمین۔

سید شبیر احمد کاکا خیل

یا اللہ

یااللہ جھوٹ و ہر گناہ سے بچانا ہم کو
جو ہے سچ مچ راہِ حق اس پہ چلانا ہم کو

جھوٹوں پہ تیری جو لعنت ہے اُس سے بچ جائیں
سچی باتیں جو ہیں بس وہ ہی سکھانا ہم کو

سنت کی اتباع میں صادق و امین بنیں
اِس کے ابلاغ کا ذریعہ بھی بنانا ہم کو

رشوت و سود کی ہر قِسم سے محفوظ کردے
اِن تباہی کی راہوں سے دور کرانا ہم کو

جھوٹ و گناہ جو سرزد ہوئے ہیں ان سے ہم
پکی توبہ کریں پھر اس پہ جمانا ہم کو

یا اللہ کردے تو معاف تو ہے کریم بہت
صراط مستقیم پر ہی چلانا ہم کو

ہر طرف جھوٹ رشوت وسود کی آندھیاں ہیں چلیں
ان سے بچا کے شریعت پہ چلانا ہم کو

ہر بھلائی فضل سے تیرے ہے قصہ مختصر
اپنے پیاروں کا تو رفیق بنانا ہم کو

ہیں وہ بھی سارے ہی تیرے فضل کے محتاج بس
یہ حقیقت ہے یہی بات سمجھانا ہم کو

ہاں صحابہ چنے تو نے ہیں حبیب کے واسطے
چلے وہ جس پہ اُسی راہ پہ چلانا ہم کو

اور انبیاء کا مقام ان سے بھی اُوپر ہے بہت
اتنا اُونچا کہ یہ مشکل ہے سمجھانا ہم کو

امام الانبیاء کا جو مقام ہے کون جانے
سوائے تیرے بس یہی ہے بتانا ہم کو

کرم سے اپنے سچا امتی بنادے ان کا
یا الٰہی آپ ﷺ کی سنت پہ چلانا ہم کو

آپ کی شان مخلوقات میں سب سے اُونچی
کردے نصیب اس کی معرفت پانا ہم کو

فضل ھوا ترا رحمت اللعالمین بنا کر آپ ﷺ کو
حوض پہ نصیب ہو واں آپ کا پلانا ہم کو

وراء الوراء ذات تیری سب تعریفیں تیری
کہ یہ بے حد ہیں بس یہی ہے بتانا ہم کو

ترا ہی فضل ہے شبیر کہے واسطے ترے
جینا مرنا اور یہ سب کرنا کرانا ہم کو

نعت شریف

ایسی اک نعت محبت کی مری ہو جائے
جو کہ دل کی مری ظلمت ہے ساری دھو جائے

اور میں آپ پہ دل سے درود یوں بھیجوں
دل مرا آپ کی محبت میں تو بس کھو جائے

ساتھ سنتوں پہ چلوں آپ کی، مجھے اللہ کے
جو محبوبوں کی لڑی ہے اس میں پرو جائے

آپ کی سیرت کو پڑھوں میں عمل کے واسطے اپنے
محبت سنتوں کی جو کہ دل میں بو جائے

جلدی شبیرؔ توبہ کر راستے پہ آپ کے تو چل
وقت ضائع نہ کر قسمت نہ تیری سو جائے

ربیعُ الاوّل

ہے ماہِ ولادت ربیع الاول
سعادت سعادت ربیع الاول

مہینہ یہ آقا کی ہجرت کا ہے
بشارت بشارت ربیع الاول

اہم کام آقا کے اس میں ہوئے
محبت محبت ربیع الاول

خدا نے اسے چن لیا جب ہے تو
محبت کی دعوت ربیع الاول

اسی میں خدا نے بلایا بھی پاس
کہ ہے ماہِ رحلت ربیع الاول

ہو اس ماہ میں بدعت کو کیسے فروغ
کہ ہے ماہِ سنت ربیع الاول

سرِمو ہٹے نہ سنت سے اُمت
یہ دیتا ہے دعوت ربیع الاول

صحابہ کے پیچھے چلو ہی چلو
کہے در حقیقت ربیع الاول

تو بدعت سے شبیرؔ ہمیں آئے گھن
سکھائے یہ نفرت ربیع الاول

مطالعہ سیرت بصورت سوال

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی خَاتَمِ النَّبِیِّیْنَ

اَمَّا بَعْدُ ۞ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۞

سوال:

آپ ﷺ کی تاریخ ولادت میں مؤرخین کا اختلاف رہا ہے البتہ اس بات پر سب متفق ہیں کہ آپ ﷺ کی ولادتِ پاک ماہِ ربیع الاوّل میں ہوئی تھی۔ آپ ﷺ کے ساتھ ہر امتی کو محبت ہے اور جس کے ساتھ کسی کو محبت ہو تو محبت کرنے والا اپنے محبوب کی زندگی کے اہم مواقع کو یاد کرتا ہے اور ان مواقع پر کچھ خصوصی کام بھی کرتا ہے۔ اس مناسبت سے ہمیں ماہ ربیع الاول میں ایسے کیا خصوصی کام کرنے چاہئیں جن کے ذریعے ہم آپ ﷺ کے ساتھ اپنی محبت کا اظہار کر سکیں؟

جواب:

یہ بات مسلم ہے کہ آپ ﷺ کی تاریخ ولادت اور تاریخ وفات دونوں میں اختلاف ہے۔ اس اختلاف کی وجہ کیا بنی، ہم یہ بات بآسانی سمجھ سکتے ہیں۔ کسی بات میں اختلاف تب ہی ہوتا ہے جب اس کا حتمی علم کسی کو نہ ہو۔ ایک آدمی اس کے بارے میں اپنی تحقیق کرتا ہے اور اپنی تحقیق کے نتیجے میں جو علم حاصل ہو اس کو درست سمجھتا ہے، دوسرا آدمی اپنی تحقیق کرتا ہے اور وہ کوئی دوسرا نتیجہ نکالتا ہے۔ نبی ﷺ کی تاریخ پیدائش کا بھی یہی معاملہ ہے کہ حتمی تاریخ کسی کو معلوم نہیں ہے، مؤرخین اور سیرت نگاروں نے اپنی اپنی تحقیق کے مطابق مختلف آراء اختیار کی ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ نبی ﷺ کی تاریخ پیدائش حتمی طور پر معلوم کیوں نہیں ہو سکی۔

اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ آپ ﷺ یتیم پیدا ہوئے تھے۔ آپ ﷺ کے والد محترم آپ ﷺ کی پیدائش سے قبل ہی وفات پا چکے تھے۔ عرب معاشرے میں یتیم کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی تھی۔ حتیٰ کہ سیرت کی کتب میں آپ ﷺ کی ولادت

مبارکہ کے وقت کا ایک واقعہ ملتا ہے کہ آپ ﷺ کی پیدائش کے دن ایک یہودی ڈھونڈتا اور پوچھتا پھر رہا تھا کہ آج کون سا بچہ پیدا ہوا ہے لیکن اس کو کسی نے آپ ﷺ کے بارے میں نہیں بتایا۔ باقی بچوں کے بارے میں تو بتایا گیا لیکن آپ ﷺ کے بارے میں نہیں بتایا گیا۔ اس نے خصوصیت سے پوچھا کہ ان کے علاوہ کوئی اور بچہ مکہ مکرمہ میں پیدا ہوا ہے یا بس یہی ہیں؟ تب کسی نے کہا کہ آج ہاشمیوں کے ہاں بھی ایک بچہ پیدا ہوا ہے۔ اس نے کہا کہ مجھے وہاں لے چلو۔

اُس وقت نبی ﷺ کی پیدائش کو اہمیت نہ دینے کی وجہ یہی تھی کہ آپ ﷺ یتیم پیدا ہوئے تھے۔ کسی یتیم بچے کا پیدا ہونا ان کے لئے اتنی غیر اہم خبر تھی کہ اس کا کوئی ریکارڈ ہی نہیں تھا۔ اگرچہ ولادتِ نبوی ﷺ سے روحانیت کی دنیا میں تو بہت بڑا انقلاب آیا تھا۔ کتبِ سیرت میں کئی واقعات کا ذکر ہے جو آپ ﷺ کی ولادت کے وقت پیش آئے تھے لیکن اُس وقت مکہ مکرمہ میں کسی کو ان چیزوں کا پتا نہیں تھا، ان کے لئے تو یہ بس ایک یتیم بچہ ہی تھا جس کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اس وجہ سے نبی ﷺ کی ولادت کی تاریخ عرب معاشرے کے اندر مخفی رہی۔ کسی کو بھی حتمی تاریخ معلوم نہ تھی۔

نبی ﷺ کی تاریخ پیدائش معلوم نہ ہونے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ دورِ نبوی اور دورِ صحابہ میں ان چیزوں کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی جاتی تھی۔ ہاں نبوت کے سلسلے میں قرآن و سنت، دین و شریعت اور اوامر و نواہی کے متعلق ہر بات محفوظ کی جاتی تھی۔ ان باتوں کا پورا ذخیرہ موجود ہے کیونکہ اس کو محفوظ رکھنے کے لئے ایک پوری جماعت موجود تھی اور ہر شخص کو یہ احساس تھا کہ آپ ﷺ جو فرماتے ہیں وہ ان کی اپنی بات نہیں بلکہ اللہ کی بات ہوتی ہے لہذا اس کو بہت اچھی طرح محفوظ رکھتے تھے، روایتیں کیا کرتے تھے، ایک دوسرے سے سوال و جواب اور مذاکرے کیا کرتے تھے۔ اس دور میں عمومی طور پر مجالس میں ہونے والی گفتگوؤں کا موضوع قرآن اور آپ ﷺ کا فرمان ہی ہوا کرتے تھے۔

نبی ﷺ کی تاریخ پیدائش کے مخفی رہنے کی تیسری وجہ یہ بھی ہے کہ وقتِ پیدائش آپ ﷺ کی شہرت کسی حوالے سے نہیں تھی۔ کچھ سال بعد آپ ﷺ اپنے

حسنِ اخلاق اور حسنِ معاملات کی وجہ سے صادق و امین کے لقب سے مشہور ہوئے، اس کے کچھ عرصہ بعد نبوت ملی، ہجرت کے واقعات ہوئے، جنگیں ہوئیں۔ تب آپ ﷺ کی شہرت عرب اور عرب سے باہر پھیلنا شروع ہوئی۔

ان وجوہات کو سامنے رکھتے ہوئے بآسانی یہ بات سمجھ آ جاتی ہے کہ ولادتِ پاک کی حتمی تاریخ کا مخفی رہنا کوئی بعید نہیں ہے۔ ہاں آپ ﷺ کی وفات کی تاریخ کا چھپا رہنا ضرور عجیب بات ہو سکتی ہے کیونکہ اس وقت آپ ﷺ پورے جزیرۂ عرب میں مشہور ہو چکے تھے، اس وقت آپ ﷺ نبی اللہ تھے، خاتم النبیین تھے۔ آپ ﷺ کے پاس ایک جماعت تھی، آپ ﷺ بحثیت حکمران پورے عرب کے حاکم بھی تھے۔ ان تمام وجوہات کے ہوتے ہوئے تاریخ وفات کا مخفی رہنا بہت عجیب بات ہے۔ لیکن غور کرنے سے پتا چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حکمت اسی میں تھی کہ یہ تاریخیں مخفی ہی رہیں۔

اُس معاشرے میں اور خصوصاً دورِ صحابہ میں ولادت و وفات کی تاریخوں کو یاد رکھنا کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ جس کی طرف ان کا دھیان جاتا۔ وہ حضرات نبی پاک ﷺ کی سیرت اور احادیث بیان کرتے تھے لیکن ولادت و وفات کی تاریخیں وغیرہ ان کی روایات میں شامل نہیں ہوتی تھیں۔ احادیث میں واقعات کی جو ترتیب ہے اسی سے مؤرخین نے اندازہ لگایا ہے کہ تاریخ ولادت اور تاریخ وفات کیا ہو سکتی ہے، چونکہ ہر ایک کی تحقیق الگ الگ ہوتی ہے اس لئے ان تاریخوں میں اختلاف ہوا ہے۔

حضرت سید سلیمان ندوی اور شبلی نعمانی کی کتاب "سیرت النبی" جلد اول میں اس موضوع پر جو لکھا ہے میں آپ کو وہ سنا دیتا ہوں۔ ان دونوں حضرات کی مرتب کردہ "سیرت النبی ﷺ" مستند ترین سیرتوں میں سے ہے۔ اس میں اِس بات کا خصوصی طور پر خیال رکھا گیا ہے کہ کونسی بات مستند ہے اور کونسی بات غیر مستند ہے۔ غیر مستند باتوں کو ان حضرات نے اپنی کتاب میں شامل نہیں کیا۔ اگر کہیں غیر مستند بات نقل کی بھی ہے تو اس پر تنقید اور جرح بھی ساتھ ذکر کی ہے۔ لکھتے ہیں:

تاریخ ولادت:

تاریخ ولادت کے متعلق مصر کے مشہور ہیئت دان عالم محمود پاشا فلکی نے ایک رسالہ لکھا ہے جس میں انہوں نے دلائلِ ریاضی سے ثابت کیا ہے کہ آپ ﷺ کی

ولادت 9 ربیع الاول روز دو شنبہ مطابق 20 اپریل 571ھ میں ہوئی تھی"

اس سے آگے کئی صفحات میں یہ بات پوری تفصیل کے ساتھ لکھی ہے کہ محمود فلکی نے یہ استدلال کیسے کیا تھا۔ اس استدلال کو روایت اور درایت دونوں قسم کے دلائل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ روایات کی تحقیق اور اَسناد بیان کی گئی ہیں اور درایتاً یعنی ریاضی کے اصولوں پر تاریخوں کی جانچ پرکھ کی گئی ہے۔ لکھتے ہیں:

1- صحیح بخاری میں ہے کہ ابراھیم علیہ السلام (آنحضرت ﷺ کے صغیر السن صاحبزادے) کے انتقال کے وقت آفتاب میں گہن لگا تھا۔ اور 10ھ تھا (اور اس وقت آپ ﷺ کی عمر کا تریسٹھواں سال تھا)

بخاری کی اس روایت سے درج ذیل باتیں حتمی طور پر معلوم ہو رہی ہیں۔ ایک یہ کہ نبی ﷺ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا انتقال سن 10 ہجری میں ہوا۔ دوسری یہ کہ جب ان کا انتقال ہوا اس دن سورج گرہن ہوا تھا۔ تیسری یہ کہ آپ ﷺ کی عمر اس وقت 63 سال تھی۔

سورج گرہن ایک ایسی چیز ہے کہ سائنس اور ریاضی کے قاعدوں کے ذریعے کئی سو سال پرانے سورج گرہن کا حساب کتاب لگایا جا سکتا ہے بلکہ ہزاروں سال پہلے کا بھی پتا لگایا جا سکتا ہے کہ سورج گرہن کب ہوا تھا اور ہزار سال بعد کا بھی پتا لگایا جا سکتا ہے کہ ہزار سال بعد سورج گرہن کب ہو گا۔ یہ با قاعدہ ریاضی کے اصول و ضوابط پر مبنی ہوتا ہے۔

"2- ریاضی کے قاعدے سے حساب لگانے سے معلوم ہوتا ہے کہ 10ھ کا سورج گرہن 07 جنوری 632ء کو 08:30 منٹ پر ہوا تھا"۔

"3- اس حساب سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر قمری 63 برس پیچھے ہٹیں تو آپ ﷺ کی پیدائش کا سال 571ء (از روئے قواعد ہیئت) ربیع الاول کی پہلی تاریخ 12 اپریل 571ء کے مطابق تھی"۔

"4- تاریخ ولادت میں اختلاف ہے لیکن اس قدر متفق علیہ ہے کہ وہ ربیع الاول کا مہینہ اور دو شنبہ کا دن تھا اور تاریخ 8 سے لے کر 12 تک میں منحصر ہے"۔

یہ حساب میں نے بھی لگایا ہے۔ ریاضی کے قواعد کو سامنے رکھتے ہوئے سورج

گرہن کا حساب لگانے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ربیع الاول میں پیر کا دن یا آٹھ تاریخ کو بنتا ہے یا 9 تاریخ کو۔ اس لئے کہ قمری تاریخ میں ایک دن کا فرق چاند کی رویت کے حساب سے ہو سکتا ہے۔ اس لحاظ سے یا آٹھ تاریخ ہو گی یا 9 تاریخ۔

دیکھئے اس تحقیق سے معلوم ہو گیا کہ نبی ﷺ کی تاریخ پیدائش 8 ربیع الاول ہے یا پھر 9 ربیع الاول ہے۔ بعض حضرات نے کتابوں میں 9 ربیع الاول لکھی بھی ہے اس وجہ سے ہم 9 ربیع الاول کو زیادہ مستند مان سکتے ہیں اور عیسوی سن کے حساب یہ تاریخ 20 اپریل 571ء عیسوی بنتی ہے۔

تاریخ ولادت کے بارے میں تاریخی اور علمی بات تو آپ نے سن لی اب عملی بات بھی سن لیں۔ یومِ ولادت منانے کا کہیں پر کوئی ثبوت نہیں ہے۔ بالخصوص 12 ربیع الاول کو یومِ ولادت منانا تو تاریخی لحاظ سے بھی غلط ہے، روایتاً بھی اس کا کوئی ثبوت نہیں اور درایتاً بھی غلط ہے۔ بلکہ عجیب بات یہ ہے کہ ہمارے خیبر پختون خواہ میں ربیع الاول کے مہینہ کو "12 وفات" کا مہینہ کہتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ 12 ربیع الاول کی تاریخ وفات کے لئے زیادہ مشہور ہے۔ لہٰذا ہمیں ولادت و وفات کے دن منانے پر زور نہیں دینا چاہیے بلکہ صحابہ کرام نے جن چیزوں پر زور دیا ان پہ ہم بھی زور دیں اور جن چیزوں پہ زور نہیں دیا ان پہ ہم بھی زور نہ دیں۔ ہماری اصل منزل اور مقصد یہی ہے۔ ایک دفعہ انسان اپنی منزل سے ہٹ جائے تو پھر وہ بھٹکتا ہی چلا جاتا ہے۔ اگر آپ نے اصل چیز کی طرف نہیں جانا تو پھر دوسری چیزوں کی طرف جانے کی کوئی حد نہیں رہے گی، ایک غلط کام کریں گے تو مزید غلط کاموں کی راہ ہموار ہوتی چلی جائے گی۔

کہتے ہیں پائلٹ کی مہارت کا پتا لینڈنگ میں چلتا ہے، take off اتنا مشکل نہیں ہوتا جتنی مشکل لینڈنگ ہوتی ہے کیونکہ take off میں جس طرف بھی نکلے گا تو آسمان میں ہی نکلے گا۔ اس میں کیا مشکل ہے، جس طرف بھی گیا تو آسمان ہی میں گیا لیکن لینڈنگ میں خاص سمت میں ہی جہاز اتارنا پڑتا ہے۔

ایک مرتبہ ہم سفر میں تھے، جہاز کی لینڈنگ سکاٹ لینڈ (انگلینڈ) میں ہونی تھی۔ فضا میں مکمل دھند چھائی ہوئی تھی، کوئی چیز نظر نہیں آ رہی تھی۔ پائلٹ نے اعلان کروا دیا کہ سب لوگ اپنے اپنے آلات بند کر دیں کیونکہ میں اب آٹو پائلٹ پہ جہاز

چلاؤں گا، اگر کسی کا موبائل وغیرہ آن ہوا تو جہاز کے navigation سسٹم میں خرابی ہو سکتی ہے جس کے نتیجہ میں جہاز تباہ بھی ہو سکتا ہے لہذا ساری چیزیں بند کرا دیں، موبائل بھی بند کرا دیں، لیپ ٹاپ بھی بند کرا دیا۔ جس وقت جہاز نیچے اتر رہا تھا اس وقت ہر طرف بے حد اندھیرا تھا، کچھ پتا نہیں چل رہا تھا کہ نیچے کیا ہے۔ خیر جہاز لینڈ ہو گیا اور بالکل آخری کنارے پہ لینڈنگ ہوئی، اگر ایک سیکنڈ کی بھی غلطی ہو جاتی تو حادثہ ہو جاتا۔ یہ پائلٹ کی مہارت کا کمال تھا کہ اس نے ایسی حالت میں بھی بالکل درست جگہ پہ جہاز اتارا۔ خود اس کو کچھ نظر نہیں آ رہا تھا لیکن ریاضی کو نظر آ رہا تھا، حساب کتاب کو نظر آ رہا تھا۔ اسی طرح نبی ﷺ کی تاریخ پیدائش میں بھی یہی معاملہ ہے کہ کسی اور کو نظر آئے یا نہ آئے ریاضی کو ضرور نظر آ رہا ہے۔ لہٰذا ہمیں ریاضی کے اصولوں کو سامنے رکھ کر تحقیق کرنی پڑے گا کیونکہ آگے پیچھے اندھیرا ہے۔

بہر حال ہم لوگوں کو اس بات کی طرف دھیان دینا چاہیے کہ ہمارے پاس معلومات حاصل کرنے کے جو ذرائع ہیں انہیں بھی اس مسئلے کے حل کے لئے استعمال کریں۔ جذباتیت کو ختم کرنا چاہیے اور اصل بات کی طرف توجہ دینی چاہیے۔ اصل بات یہ ہے کہ آپ ﷺ جو دین لے کے آئے تھے اس کو سینے سے لگانا ہے، اس پر عمل کرنا ہے، جو آپ ﷺ دیں اس کو لو اور جس سے آپ ﷺ منع کریں اس سے رک جاؤ۔ اللہ پاک نے یہی فرمایا ہے۔ لہذا آپ ﷺ جو ہمیں دے رہے ہیں ہم اس کو لیں گے۔ صحابہ کرام نے یہی کیا تھا۔ صحابہ کرام اسی میں حریص تھے۔ وہ یہ جاننے کے حریص نہیں تھے کہ آپ ﷺ کی ولادتِ پاک کب ہوئی تھی اور وفات کب ہوئی۔ وہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، اس میں کسی انسان کا اختیار نہیں ہے وہ غیر اختیاری چیز ہے۔ صحابہ کرام اختیاری کاموں کو کرتے تھے غیر اختیاری کے درپے نہیں ہوتے تھے۔ اللہ جل شانہ ہم سب کو سمجھدار بنائے اور جو کام کرنے کے ہیں ہم وہی کریں، جو کام کرنے کے نہیں ہیں ان سے بچیں۔ جن چیزوں کے ساتھ کوئی غرض نہ ہو ان کے بارے میں ہمارا نقطۂ نظر یہی ہو کہ ہم ان کے درپے نہ ہوں

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

بیان جمعۃ المبارک

حضرت شیخ سید شبیر احمد کاکاخیل صاحب مدظلہ العالی

اَمَّا بَعْدُ فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝
لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ ۝ (الحجرات: 2)
اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَ
سَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝ (الاحزاب: 56)

معزز خواتین و حضرات!

آج جمعہ کا دن ہے اور ربیع الاول کا مہینہ ہے۔ ایک بہت بڑی حقیقت ہمارے سامنے ہے۔ اگرچہ ہم دنیا کی بھول بھلیوں اور گہما گہمیوں میں اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں لیکن جس طرح کوئی آدمی سورج سے اوٹ میں ہو جائے تو سورج پہ کوئی فرق نہیں پڑتا، سورج اپنی جگہ موجود رہتا ہے بلکہ اس چھپنے والے کو سورج کی روشنی نہیں پہنچتی۔ اسی طرح حقائق سے کوئی انکار نہیں کر سکتا، جو انکار کرتا ہے وہ اپنا ہی نقصان کرتا ہے۔ آج ربیع الاول کے مہینے اور جمعہ کے دن کی مناسبت سے "آپ ﷺ کی محبت اور تعظیم و توقیر میں صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کا عمل" کے موضوع پر بات ہو گی۔

تمام جن وانس کو اس بات کا مکلّف کر دیا گیا ہے کہ وہ آپ ﷺ سے تمام مخلوقات میں سب سے زیادہ محبت کریں۔ اس محبت کا کیا طریقہ اور سلیقہ ہو، اس بارے میں ہمارے لئے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو معیار بنایا گیا ہے۔ ہمیں صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے طرزِ زندگی کو دیکھنا ہو گا کہ انہوں نے اس بات پر کتنا عمل کیا اور کیسے کیا ہے؟ اس سے ہمیں ایک راستہ مل جائے گا پھر ہم اسی طریقہ پہ چلیں گے۔

آج ہم آپ ﷺ کی شانِ محبوبیت کو حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا کے خلیفۂ اَجل حضرت صوفی محمد اقبال کی کتاب "اَلْعُطُوْرُ الْمَجْمُوْعَةُ" سے بیان

کریں گے۔ یہ کتاب واقعی "اَلْعُطُوْرُالْمَجْمُوْعَۃُ" ہے کیونکہ اس میں اپنے دور کے دو بڑے بزرگوں کی تعلیمات کو یکجا کیا گیا ہے۔ یہ دونوں بزرگ آپ ﷺ کی محبت سے سرشار تھے۔ ایک حضرت مولانا اشرف علی تھانوی ہیں اور دوسرے حضرت مولانا زکریا صاحب ۔ حضرت تھانوی نے "نَشْرُالطِّیْب، فِیْ ذِکْرِالنَّبِیِّ الْحَبِیْبِ" لکھی جبکہ حضرت مولانا زکریا نے "فضائلِ اعمال" لکھی۔ حضرت تھانوی نے اپنی کتاب میں چالیس درود و سلام کو جمع کیا جسے حضرت مولانا زکریا نے اپنی کتاب "فضائلِ درود شریف" میں مِنّ و عن نقل کیا اور اس کا نام "مقبول وظیفہ" یا "چہل حدیث درود و سلام" رکھا اور حضرت کے خلفاء نے اس کو چہار دانگ عالم میں پھیلا دیا۔ حضرت صوفی محمد اقبال نے ان دونوں حضرات کے سیرتِ نبوی ﷺ سے متعلق ارشادات و افادات کو جمع کیا ہے اور اپنے مخصوص رنگ میں بیان کیا ہے۔ اس لئے یہ کتاب واقعی "(اَلعُطُوْرُالْمَجْمُوْعَۃُ)" ہے۔ حضرت صوفی محمد اقبال صاحب اس کتاب کو چھپوانے کے لئے بنفس نفیس بیروت تشریف لے گئے تھے تاکہ کتاب کی طباعت خوبصورت سے خوبصورت ہو۔ حالانکہ ضعیف العمری کا زمانہ تھا، مختلف امراض لاحق تھے لیکن حضرت اس مقصد کے لئے خصوصی طور پر بیروت تشریف لے گئے۔ حضرت مولانا محمد اشرف سلیمانی جو میرے شیخ تھے، انہوں نے اس کتاب پر تقریظ لکھی ہے اور محبت سے بھرپور تقریظ لکھی ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس تقریظ کے لکھوانے کا ذریعہ مجھے بنایا گیا۔ صوفی محمد اقبال صاحب نے مجھے حضرت مولانا محمد اشرف سلیمانی کے پاس بھیجا کہ حضرت سے تقریظ لکھوا دو تاکہ حضرت کا فیض بھی اس میں شامل ہو جائے۔ میں نے جا کر حضرت سے عرض کیا تو حضرت نے فرمایا کہ میں ابھی لکھتا ہوں آپ یہیں ٹھہریں۔ ظہر کے بعد تقریظ لکھنا شروع فرمائی، درمیان میں عصر کی نماز پڑھی، اس کے بعد لکھتے رہے لکھتے رہے حتیٰ کہ مغرب کے وقت تقریظ مکمل کر کے مجھے دے دی اور میں حضرت صوفی محمد اقبال صاحب کے پاس لے آیا۔ یہ ہمارے لئے بڑی سعادت کی بات ہے کہ اللہ پاک نے اس کے لئے ہمیں ذریعہ بنایا۔ آج چونکہ جمعہ کا دن ہے اور ربیع الاول کا مہینہ ہے لہٰذا اسی مناسبت سے اس کتاب "العُطُورُ المجموعہ" سے کچھ اقتباسات پڑھیں گے اور سمجھیں گے۔

متن: (اَلْعُطُوْرُ الْمَجْمُوْعَةُ)

آپ ﷺ کی شانِ محبوبیت:

یہاں ایسی محبت کا بیان کیا جاتا ہے جس کا سبب ایمان ہے۔ یہ محبت سب محبتوں پر غالب، گہری اور ایسی ضروری ہے کہ اس کے بغیر دوسری قسم کی محبت کا اعتبار نہیں۔ اس محبت کی تعریف میں اختلاف ہے۔ بعض حضرات اس کو حُبِّ ایمانی یا حُبِّ عقلی کہتے ہیں اور بعض اسے حُبِّ طبعی قرار دیتے ہیں لیکن یہ سب لفظی اختلاف اور تعبیرات کا فرق ہے۔

عِبَارَاتُنَا شَتّٰی وَ حُسْنُكَ وَاحِدٌ
وَ كُلٌّ اِلٰی ذَاكَ الْجَمَالِ يُشِيْرُ

اور شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا مہاجر مدنی کے بیان سے اس کا حُبّ طبعی ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ (حضرت کے ارشادات ان شاء اللہ آگے درج کئے جائیں گے) وہ اس کو کمالِ ایمان کے لئے ہی نہیں بلکہ نفسِ ایمان کے لئے ضروری قرار دیتے ہیں اور دیگر اسبابِ محبت جو گزشتہ اوراق میں گزرے ہیں اُن سے اس محبت کا ظہور ہوتا ہے اور جِلاء ہوتی ہے اور اس کے ثمرات و نتائج برآمد ہوتے ہیں، جن میں اعظم ثمرہ محبوب کی اتباع ہے۔ اتباع ہی اس پوشیدہ محبتِ ایمانی کی علامت قرار دی جاتی ہے اور اتباع ہی سے اللہ تعالیٰ کی محبت اور مغفرت کا انعام ملتا ہے۔

۲۔ محبتِ رسول ﷺ کا علیٰ سبیل الکمال ہونا:

ہر مومن میں محبتِ رسول ﷺ کا علیٰ سبیل الکمال ہونا شرعاً واجب ہے اور اس کے وجود کا عام مومنین میں مشاہدہ بھی ہے۔ در اصل یہ بحث ایمان کے کم اور زیادہ ہونے کے مشابہ ہے۔ زیادتی اور نقصان کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ حضرت امام اعظم فرماتے ہیں

"اَلْاِيْمَانُ لَا يَزِيْدُ وَلَا يَنْقُصُ"

ترجمہ: "ایمان گھٹتا بڑھتا نہیں"۔

اس میں شک نہیں کہ ایمان تصدیقِ قلبی کا نام ہے۔ اس یقین میں زیادتی اور

نقصان کی گنجائش نہیں۔ اس لئے کہ جو قبولِ زیادت یا نقصان کرے وہ داخلِ دائرۂ ظن ہے، یقین نہیں ہے"۔

تشریح:

یعنی جس چیز میں کمی زیادتی ہو سکتی ہو وہ یقین کا فائدہ نہیں دیتی بلکہ ظنیات میں شامل ہوتی ہے۔

متن: (اَلْعُطُوْرُ الْمَجْمُوْعَةُ)

"البتہ اعمالِ صالحہ کی ادائیگی یقین میں روشنی پیدا کرتی ہے اور اس سے یقین کے ثمرات ظاہر ہونے لگتے ہیں اور اعمالِ غیرِ صالحہ یقین کو تاریک کر دیتے ہیں اور نفاق کے مشابہ برے نتائج ظاہر ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر دو برابر کے آئینے ہوں ایک تو صاف ستھرا ہو دوسرے پر گرد و غبار ہو تو صاف آئینہ کا فائدہ اور اس کا وجود ظاہر ہو گا اور دوسرے کا کوئی فائدہ ظاہر نہ ہو گا۔ حالانکہ آئینہ ہونے کے لحاظ سے دونوں برابر ہیں۔ اس طرح ہر مومن خواہ وہ فاسق و فاجر ہو اس میں بھی اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کی محبت کا ہونا ضروری ہے۔ اگر ایسا نہیں تو وہ مومن ہی نہیں اور اس کو اللہ تعالیٰ کی محبت بھی حاصل نہیں۔

3۔ اللہ کے حبیب کی محبت اللہ کی محبت میں مندرج ہے:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے محبت رکھو اس وجہ سے کہ وہ تم کو غذا میں اپنی نعمتیں دیتا ہے اور مجھ سے (یعنی رسول اللہ ﷺ سے) محبت رکھو اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ کو مجھ سے محبت ہے۔ (ترمذی)

فائدہ: اس کا مطلب یہ نہیں کہ صرف غذا دینے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت رکھو بلکہ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کمالات و احسانات بے شمار ہیں اگر کسی کی سمجھ میں نہ آئیں تو یہ احسان تو بہت ظاہر ہے جس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ یہی سمجھ کر (مذکورہ بالا وجہ سے) اس سے محبت کرو۔

تشریح:

پیغمبر کی شان یہ ہے کہ وہ نزول میں کمال کے درجہ پہ ہوتا ہے یعنی وہ اس انداز میں بات کرتا ہے کہ کم سے کم سمجھ رکھنے والا بھی اس بات کو سمجھ سکے۔ دیکھئے نبی ﷺ یہ بات سمجھا رہے تھے کہ اللہ پاک سے محبت کیوں کرنی چاہیے۔ اگر نبی ﷺ یہ بات سمجھانے کے لئے کوئی مشکل انداز اختیار فرماتے تو لوگ کیا سمجھتے؟ لیکن آپ ﷺ نے ایسا طرزِ بیان اختیار فرمایا جس سے ایک بچہ بھی یہ بات بخوبی سمجھ سکتا ہے۔ فرمایا کہ اللہ پاک سے اس لئے محبت کرو کہ اس نے تمہیں سب کچھ دیا ہے۔

بات کو اس انداز میں سمجھانا کہ وہ پیچیدہ بھی نہ ہو اور حقِ مطلب بھی ادا ہو جائے یہ بڑے کمال کا ملکہ ہوتا ہے۔ ہمارے ایک ساتھی نے گفتگو کے دوران ایک بڑی اچھی بات کہی کہ کمال ہے جتنا جتنا ہم اوپر جاتے ہیں، آپ ﷺ کے قریب ہوتے جاتے ہیں اتنے زیادہ انسان نظر آتے ہیں اور جب نیچے آتے ہیں تو بزرگ نظر آتے ہیں۔

ان کی یہ بات واقعی درست ہے کہ ہم جتنا اوپر جاتے ہیں، صحابہ کرام اور نبی ﷺ کی زندگیوں کو دیکھتے ہیں تو یہ سب حضرات ہمیں بالکل عام انسانوں کی طرح محسوس ہوتے ہیں اور جب نیچے آتے ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے بزرگ ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان حضرات میں نزول کامل ہوتا ہے، وہ ظاہراً بالکل عام لوگوں کے مرتبہ میں ہوتے ہیں، لیکن عام لوگوں کے مرتبہ میں رہ کر تقویٰ کی اعلیٰ منزلوں پر ہوتے ہیں جبکہ عام لوگ ایسا نہیں کر سکتے، عام لوگوں کے لئے یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ تقویٰ کے اعلیٰ درجات پر پہنچ کر بھی عام نظر آئیں۔ صحابہ کرام کے مقام کو جاننے کے لئے اس نکتہ کا سمجھنا بھی ضروری ہے۔

متن: (اَلْعُطُوْرُ الْمَجْمُوْعَةُ)

"رسولِ اعظم ﷺ کی محبت اللہ تعالیٰ کی محبت میں داخل ہے کیونکہ اللہ کی محبت اسی وقت معتبر ہے اور کار آمد ہے جب اللہ کے حبیب ﷺ کے ساتھ بھی محبت ہو۔ اسی طرح اللہ کے حبیب ﷺ کی محبت اسی وقت معتدٌ بہ اور نافع ہے جب اللہ تعالیٰ کی محبت بھی ہو (جس کا ادنیٰ درجہ کفر سے نکلنا ہے) اگر کوئی کم بخت کہے کہ میں رسول اللہ ﷺ سے محبت کرتا ہوں اللہ کو چھوڑ کر، تو وہ کافر اور مردود ہے۔ بہت سے کفار

کو حضور اقدس ﷺ کے کمالات و محاسن کی وجہ سے عقیدت و محبت ہوتی ہے جس کے اظہار میں وہ نعتیہ اشعار بھی پڑھتے ہیں، مضامین لکھتے ہیں مگر وہ سب کچھ نجات کے معاملہ میں بے کار اور بالکل غیر معتبر ہے۔ آپ ﷺ کے ساتھ محبت اس وقت معتبر ہو سکتی ہے جب اس کی محبت کا منشاء ایمان باللہ ہو۔

تشریح:

ایک ہندو نے نبی پاک ﷺ کی مدح میں ایک خوبصورت شعر کہا ہے۔

عشق ہو جائے کسی سے، کوئی چارہ تو نہیں
صرف مسلم کا محمد پہ اجارہ تو نہیں

وہ ہندو کہتا ہے کہ صرف مسلمان ہی آپ ﷺ کے ساتھ محبت کریں یہ ضروری تو نہیں ہے، ہمیں بھی حضرت محمد ﷺ کے ساتھ محبت ہے۔

ایک دوسرا ہندو شاعر جس کا نام غالباً بھیم داس نرائن ہے۔ یہ نابینا تھا، اس نے آپ ﷺ کی تعریف میں نعت لکھی اور حج کے لئے مکہ جانے والے مسلمانوں کو دی اور کہا کہ یہ روضۂ اقدس پہ میری طرف سے پڑھ دینا۔ جس وقت وہ نعت روضۂ اقدس پہ پڑھی جا رہی تھی، عین اسی وقت اس کی آنکھوں میں بینائی آ رہی تھی۔ جب نعت مکمل ہو گئی تو اس کی بینائی مکمل طور پر ٹھیک ہو گئی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے لوگ جن کا نبی ﷺ کی تعلیمات پر ایمان نہیں جب وہ نبی پاک ﷺ سے عقیدت رکھتے ہیں تو انہیں دنیا کا فائدہ تو ہو جاتا ہے لیکن آخرت کا فائدہ تب ہی ہو گا جب اس محبت کے ساتھ ایمان بھی ہو، کیونکہ اخروی نجات کا مدار ایمان پر ہے، بغیر ایمان کے نجات نہیں ہے۔

متن: (اَلْعُطُوْرُ الْمَجْمُوْعَةُ)

"امیر المومنین فی الحدیث حضرت امام بخاری نے اپنی صحیح البخاری کی کتابُ الایمان میں محبتِ رسول اللہ ﷺ پر مستقل باب باندھا ہے۔

"بَابُ حُبِّ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ مِنَ الْاِيْمَانِ"

ترجمہ: "باب اس بیان میں کہ حضور اقدس ﷺ سے محبت ہونا ایمان کا جزو ہے"۔
حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا مہاجر مدنی اپنی "تقریر بخاری" میں فرماتے ہیں اگر کسی کو آپ ﷺ سے محبت نہیں تو وہ مسلمان ہی نہیں۔
اب یہاں کچھ روایات ذکر کی جاتی ہیں جن سے حضور ﷺ سے کمالِ محبت کا شرعاً وجوب ثابت ہوتا ہے۔

اپنی جان اور اولاد سے زیادہ محبت مطلوب ہے:

حضرت انس سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ بندہ ایماندار نہیں ہوتا جب تک کہ میرے ساتھ اتنی محبت نہ رکھے کہ تمام اہل و عیال اور تمام آدمیوں سے بھی زیادہ۔ (روایت کیا اس کو مسلم نے) اور بخاری میں عبد اللہ بن ہشام کی روایت میں یہ بھی ہے کہ حضرت عمر نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ بے شک مجھ کو آپ کے ساتھ سب چیزوں سے زیادہ محبت ہے بجز اپنی جان کے (یعنی اپنی جان کے برابر آپ کی محبت معلوم نہیں ہوتی)۔ آپ ﷺ نے فرمایا: قسم اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، ایماندار نہیں ہو گے جب تک میرے ساتھ اپنی جان سے زیادہ محبت نہیں رکھو گے۔ حضرت عمر نے عرض کیا کہ اب تو آپ کے ساتھ اپنی جان سے بھی زیادہ محبت معلوم ہوتی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اب پورے ایماندار ہو اے عمر!

فائدہ: حضرت حکیم الامت تھانوی فرماتے ہیں کہ اس بات کو آسانی کے ساتھ یوں سمجھو کہ حضرت عمر نے اول غور نہیں کیا تھا۔ یہ خیال کیا کہ اپنی تکلیف سے جتنا اثر ہوتا ہے دوسرے کی تکلیف سے اتنا اثر نہیں ہوتا۔

تشریح:

یہ بات بہت اہم ہے اس کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہوں گا لیکن پہلے حضرت کی بات سن لیں۔

متن: (اَلْعُطُوْرُ الْمَجْمُوْعَةُ)

یہ خیال کہ اپنی تکلیف سے جتنا اثر ہوتا ہے دوسروں کی تکلیف سے اتنا اثر نہیں

ہوتا۔ اس لئے اپنی جان زیادہ پیاری معلوم ہوئی۔ پھر سوچنے پر معلوم ہوا کہ اگر جان دینے کا موقع آ جائے تو یقینی بات ہے کہ حضور ﷺ کی جان بچانے کے لئے ہر مسلمان اپنی جان دینے کے لئے تیار ہو جائے اس طرح آپ ﷺ کے دین پر بھی جان دینے سے کبھی منہ نہ موڑے تو اس طرح آپ ﷺ جان سے بھی زیادہ پیارے ہوئے۔(حیٰوۃ المسلمین)

تشریح:

عاجلہ کی محبت فطری ہے۔ انسان فوری چیز کا اثر زیادہ لیتا ہے البتہ جب محبت عقلی اور ایمانی ہو تو پھر جس وقت عقل اور ایمان کے تقاضے سامنے آئیں تو انسان عاجلہ کو اختیار نہیں کرتا۔ مثلاً آدمی ہر وقت اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے بارے میں نہیں سوچتا لیکن اگر اس کے سامنے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی مخالفت یا توہین کی جائے تو انسان جان لینے اور دینے پر بھی تیار ہو جاتا ہے۔

متن: (اَلْعُطُوْرُ الْمَجْمُوْعَۃُ)

"اس بات کو سمجھانے کے لئے بعض حضرات نے محبت کی قسمیں بیان کی ہیں کہ ایک محبت طبعی ہوتی ہے، ایک عقلی اور یہاں (حدیث بالا میں) مقصود و مطلوب محبتِ عقلی ہے نہ کہ طبعی۔ لیکن حضرت شیخ الحدیث اپنے والد صاحب حضرت یحییٰ صاحب کی طرف سے یہ نقل فرمایا کرتے تھے کہ یہاں مطلوب جو محبت ہے وہ محبتِ طبعی ہے لیکن یہ جو بسا اوقات شبہ ہوتا ہے کہ اولاد وغیرہ کی محبت حضور ﷺ سے زائد معلوم ہوتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ رسولِ کریم ﷺ کی محبت کے مواقع (امتحان و اظہار کے) بہت کم پیش آتے ہیں بخلاف ان اولاد و اقارب کی محبت کے۔ چنانچہ اگر دونوں میں تصادم ہو جائے تو آپ ﷺ کی محبت ہی راجح ہو گی۔ مثلاً کسی کی بیوی حضور اقدس ﷺ کو نعوذ باللہ برا بھلا کہہ دے تو وہ ہر گز برداشت نہیں کرے گا بلکہ گلا تک گھونٹ دے گا۔ اسی طرح اگر کسی کا لڑکا قرآن پاک پر پیر رکھ دے تو وہ دور ہی سے ڈانٹتا ہوا دوڑے گا اور اگر کوئی ایسا نہیں کرتا تو وہ مسلمان ہی نہیں۔

تشریح:

حضرت نے جیسے پہلے فرمایا تھا کہ علماء کے درمیان یہ بحث تو ہے کہ یہ طبعی محبت ہے یا عقلی محبت ہے۔ کسی نے کہا طبعی محبت ہے اور کسی نے کہا کہ عقلی محبت ہے۔ حضرت کا اپنا رجحان اسی طرف ہے جس طرف حضرت تھانوی اور حضرت مولانا زکریا صاحب گئے ہیں، ان دونوں حضرات کے نزدیک محبت طبعی ہونی چاہیے، حضرت صوفی محمد اقبال صاحب کا رجحان بھی اسی طرف ہے اس لئے وہ اسی کے دلائل دے رہے ہیں۔ در اصل اس کو عقلی محبت اس لئے کہا گیا ہے کہ یہ ایمان سے وابستہ ہے اور ایمان کی بنیاد پر ہے، چونکہ ایمان دل میں ہوتا ہے لیکن اس کو محسوس عقل کرتی ہے۔ اس وجہ سے جس وقت انسان کے دل میں ایمان ہو تو اس کے سارے پیمانے تبدیل ہو جاتے ہیں۔ مثلاً کافر بھی ذہین ہوتا ہے اور مسلمان بھی ذہین ہوتا ہے لیکن کافر کی ساری ذہانت و قوت دنیا کے لئے استعمال ہو رہی ہے، وہ دنیا کے بارے میں سوچتا ہے جبکہ مسلمان آخرت اور دنیا دونوں کی فکر کرتا ہے، ہاں جب دونوں میں سے ایک کو چننا ہو تو مسلمان آخرت کا انتخاب کرتا ہے۔ اس کا سبب ایمان ہے۔ کافر کو یہ بات سمجھ نہیں آتی کہ آخر یہ ایمان کیا شے ہے جس کی وجہ سے یہ لوگ بادشاہتیں تک چھوڑ دیتے ہیں۔

حضرت تھانوی نے لکھا ہے کہ میں نے جب بہشتی زیور لکھی تو اس کے حقوق اپنے نام پر محفوظ نہیں کروائے۔ ایک انگریز نے مجھ سے پوچھا کہ اگر آپ نے اس کے حقوق اپنے نام نہیں کروائے تو آپ کو اس کا فائدہ کیا ہے؟ اب میں اس کو کیسے بتاتا کیونکہ اس کو یہ بات سمجھ ہی نہیں آ سکتی تھی کہ میں نے آخرت کے فائدہ کے لئے دنیا کا فائدہ چھوڑ دیا ہے۔

دیکھئے انگریز لوگ بھی خیرات وغیرہ کرتے ہیں لیکن ان کی خیرات اپنے دنیاوی سکون کے لئے ہوتی ہے، وہ اس خیرات کے ذریعے اپنے آپ کو پر سکون کرتے ہیں۔ جب تک انہیں بے سکونی اور ڈپریشن کے عوارض پیش نہیں آتے تب تک ان کو عطیات کا خیال نہیں آتا بلکہ وہ ظلم پر ظلم کر رہے ہوتے ہیں۔ جبکہ مسلمان عبادات، صدقات و خیرات اور طاعات صرف دنیاوی اور ذہنی سکون کے لئے نہیں کرتا بلکہ وہ

یہ سب کام ایمان کی وجہ سے کرتا ہے۔ اس کے دل میں ایمان ہوتا ہے اور عقل اس سے اثر قبول کرتی ہے اور ایمان کی روشنی میں عاجلہ (فوری) چیز کو چھوڑنے اور آجلہ (آخرت) کو اختیار کرنے کا فیصلہ کرتی ہے۔

حضرت عمر نے پہلے تو کہا تھا کہ مجھے میری جان زیادہ پیاری ہے، کیونکہ یہ طبیعت کا تقاضا تھا اور طبیعت کے تقاضے ہر وقت سامنے ہوتے ہیں جبکہ نبی ﷺ کی محبت عقلی تھی، اور عقل کے تقاضے ہر وقت سامنے نہیں ہوتے بلکہ جب موقع آئے تبھی پیش آتے ہیں۔ جب نبی ﷺ نے خاص طور پر ذکر کر کے فرمایا کہ جب جان سے بھی زیادہ میری محبت نہ ہو تب تک ایمان کامل نہیں تو ان کے سامنے عقلی طور پر یہ بات آ گئی اور انہیں پتا چل گیا کہ یہ تو ایمان کا تقاضا ہے کہ نبی ﷺ کے ساتھ سب سے زیادہ محبت ہو۔ تب انہوں نے عرض کیا کہ میں اب آپ سے اپنی جان سے بھی زیادہ محبت کرتا ہوں۔

ہر آدمی عقلی اور ایمانی محبت کا ہی مکلف ہے، ہاں جس شخص کا ایمان یقین کے لحاظ سے درجہ بدرجہ ترقی کرتا رہتا ہے اس پر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ اس کی عقلی محبت طبعی محبت بن جاتی ہے۔یہاں تک کہ وہ محبت اتنی راسخ ہو جاتی ہے کہ آپ ﷺ کا نام سن کر ہی حالت بدل جاتی ہے، رقت طاری ہو جاتی ہے اور رونا آ جاتا ہے، جذبات بدل جاتے ہیں۔ یہ سب طبعی چیزیں ہیں، عقلی نہیں ہیں۔

معلوم ہوا کہ ابتداءً تو عقلی محبت ہی تھی مگر بعد میں وہی طبعی بن گئی۔ ایسی طبعی محبت جس کی بنیاد اور اساس ایمانی اور عقلی محبت ہو، وہ بڑی پائیدار محبت ہوتی ہے۔ خیر دونوں میں سے جو بھی محبت حاصل ہو اس پہ اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے، اللہ پاک دونوں قسم کی محبتوں سے خوش ہوتے ہیں۔ باقی اکابر کے اپنے اپنے ذوق کی بات ہے، کسی کا ذوق اور مناسبت محبتِ عقلی کو ترجیح دیتا ہے تو کسی کا ذوق محبتِ طبعی کا ہے۔ دونوں طرف ہمارے اکابر ہیں اس وجہ سے ہم اس پر زیادہ بات نہیں کرتے۔ مزید یہ کہ دونوں طرف فرق صرف لفظوں کی حد تک ہے، اصل بنیاد اور نتیجہ ایک ہی ہے۔

متن: (اَلْعُطُوْرُ الْمَجْمُوْعَةُ)

"مسلمان خواہ کتنا ہی گنہگار ہو اس میں اللہ اور رسول کی محبت لازمی ہے۔ حضرت

عمر سے روایت ہے کہ ایک شخص کو جناب رسول اللہ ﷺ نے شراب پینے کے جرم میں سزا دی، پھر ایک دن حاضر کیا گیا، پھر آپ نے حکم سزا کا دیا، ایک شخص نے مجمع میں سے کہا کہ اے اللہ اس پر لعنت ہو کہ کس قدر کثرت سے اس کو (اس مقدمہ میں) لایا جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس پر لعنت مت کرو۔ واللہ میرے علم میں یہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت رکھتا ہے۔ (روایت کیا اس کو بخاری نے)

تشریح:

میں نے بیان کے آغاز میں سورج کی مثال دی تھی کہ سورج اپنی جگہ پہ موجود رہتا ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن درمیان میں کوئی آڑ آ جائے تو اس آڑ کی وجہ سے آپ کو اس کی روشنی نہیں پہنچتی۔ اسی طریقے سے اللہ اور اللہ کے رسول کی محبت ہر مسلمان کے دل میں ہمیشہ موجود ہوتی ہے لیکن اس کے نفس کی خواہشات کی آڑ آ جاتی ہے، اس آڑ کی وجہ سے وقتی طور پر اس آدمی تک اُس محبت کی روشنی نہیں پہنچتی اور وہ گناہ کر بیٹھتا ہے، جب وہ آڑ ہٹ جاتی ہے تو اسے ندامت و پشیمانی بھی ہوتی ہے۔ لہٰذا گنہگار مسلمان سے بھی اللہ و رسول اللہ ﷺ کی محبت کی نفی نہیں کی جائے گی بلکہ اس سے اس کے نفس کے شر کا خاتمہ کرنے کو کہا جائے گا۔

نقشبندی سلسلے میں ابتدا جذب سے کرواتے ہیں۔ بعض دفعہ انسان کو جذب و محبت حاصل ہو جاتے ہیں لیکن نفس کا سلوک طے نہیں ہوا ہوتا لہذا نفس کے شر سے پیدا ہونے والی غلطیاں ہو رہی ہوتی ہیں، آدمی ان چیزوں سے دور نہیں ہو رہا ہوتا جو نفسِ امارہ کی وجہ سے پیش آتی ہیں۔

حاصلِ کلام یہ ہے کہ مسلمان گنہگار بھی ہو تو اس سے نبی ﷺ کی محبت کی نفی نہیں کی جائے گی، یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس کے دل میں محبتِ نبوی ﷺ نہیں ہے، بلکہ یہ کہا جائے گا کہ بعض اوقات اس پر نفسِ امارہ غالب آ جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ گناہ کر بیٹھتا ہے لہٰذا نفسِ امارہ کو نفسِ مطمئنہ بنانے کے لئے محنت کی ضرورت ہے۔

متن: (اَلْعُطُوْرُ الْمَجْمُوْعَةُ)

"**فائدہ:** اس حدیث سے چند امور ثابت ہوئے۔ ایک بشارت مذنبین کو کہ ان

سے اللہ اور رسول کی محبت کی نفی نہیں کی گئی ہے۔ دوسرے تنبیہ مذنبین کو کہ نری محبت سزا سے بچنے میں کام نہ آئی تو کوئی اس میں ناز میں نہ رہے کہ بس خالی محبت بدون اطاعت کے سزائے جہنم سے بچا لے گی۔

تشریح:

یہ ایک المیہ ہے کہ بعض لوگ ایسا ہی سمجھتے ہیں کہ ہم اطاعت نہ بھی کریں تو صرف محبت ہمیں سزائے جہنم سے بچا لے گی۔

ہمارے دفتر میں ایک ساتھی تھے جن کے ساتھ ہماری گپ شپ ہوتی رہتی تھی۔ ایک مرتبہ ان کے کوئی دوست ملنے آئے۔ دورانِ گفتگو وہ کہنے لگے کہ بھائی ہم تو بس کالی کملی والے کے دامن میں پناہ لیں گے۔ میں نے یہ سن کر کہا: کیا مطلب؟ ان کے دوستوں نے جو انہی کے مسلک کے تھے ان سے کہا کہ یہاں پر دلیل کے ساتھ بات کرنی پڑے گی، گپ شپ نہیں چلے گی۔ اس پر وہ چپ ہو گئے۔

بہر حال بغیر طاعات کے صرف محبت کی بنا پر سزائے جہنم سے بچنے کا خیال طفل تسلیاں دینے والی بات ہے۔ ع

بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

شوگر کے مریض بھی کچھ ایسا ہی رویہ اختیار کرتے ہیں۔ ان کا نفس انہیں میٹھا کھانے پہ مجبور کرتا ہے اس کے لئے مختلف ڈھکوسلے اور بہانے سامنے رکھتا ہے اور وہ اس کے ہاتھوں بہک کر میٹھا کھاتے چلے جاتے ہیں اور بعد میں خطرناک نتائج بھگتتے ہیں۔

خیر! یہاں دو باتیں بتائی گئی ہیں اور دونوں باتیں بالکل درست اور مسلم ہیں۔ ایک یہ کہ مسلمان گنہگار بھی ہو تب بھی اس کے دل میں نبی ﷺ کی محبت ہوتی ہے۔ دوسری یہ کہ صرف محبت کی بنا پر عذاب سے بچنا ممکن نہیں ہے۔ ہاں جس پہ اللہ کا فضل ہو جائے گا تو الگ بات ہے لیکن سنت اللہ یہی ہے کہ عذاب سے بچنے کے لئے نبی پاک ﷺ کی عملی طور پر اطاعت کرنا ضروری ہے۔

متن: (اَلْعُطُوْرُ الْمَجْمُوْعَةُ)

"الحاصل محبت کا ہونا تو مشاہدہ ہے۔ مزید کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ صرف ایک

ضابطہ کا اشکال ہے کہ محبتِ طبعی تو اضطراری اور غیر اختیاری ہوتی ہے۔ شریعت میں غیر اختیاری بات کا مطالبہ کیوں کر درست ہوا؟ جواب یہ ہے کہ محبتِ طبعی کا منشا محبتِ قرب ہوتا ہے۔ جہاں جس مقدار کا قرب ہوتا ہے وہاں محبت بھی اتنی ہوتی ہے حضور اقدس ﷺ کے قرب کی خود محبت کے پیدا کرنے والے نے خبر دی ہے۔ ارشاد ہے کہ

﴿اَلنَّبِیُّ اَوۡلٰی بِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ مِنۡ اَنۡفُسِہِمۡ﴾ (الاحزاب: 6)

ترجمہ: "ایمان والوں کے لیے یہ نبی ان کی اپنی جانوں سے بھی زیادہ قریب تر ہیں"۔

لہذا ایمان لاتے ہی اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ خصوصی تعلق خود بخود طبعی طور پر پیدا ہو جاتا ہے۔ اس اندرونی طبعی تغیّر کو اس مثال سے سمجھیں کہ کسی عورت سے نکاح کرتے ہی اس عورت کی ماں جو پہلے غیر محرم تھی وہ فوراً مرد کی محرم ہو جاتی ہے اب وہ عورت مرد دونوں خواہ دیندار متقی نہ بھی ہوں ان میں اندرونی طور پر ایک ایسا تغیر آ جاتا ہے کہ عورت ماں کی طرح عادۃً مامون قرار دی جاتی ہے۔

تشریح:

جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ محبتِ طبعی اور محبتِ عقلی کے بارے میں اکابر کا مختلف ذوق ہے کچھ اکابر محبتِ طبعی کی طرف رجحان رکھتے ہیں اور بعض اکابر محبتِ عقلی کی طرف۔ حضرت صوفی محمد اقبال کا رجحان محبتِ طبعی کی طرف ہے، لہٰذا وہ اس سلسلے میں دلائل دے رہے ہیں۔ حضرت کا فرمانا یہ ہے کہ ایمان لاتے ہی اللہ و رسول ﷺ کے ساتھ ایک تعلق اور محبت طبعاً ہو جاتی ہے۔ محبتِ عقلی والے حضرات اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ شریعت میں اختیاری امور کا حکم ہے اور اختیاری امر عقلی ہوتا ہے جبکہ طبعی امور غیر اختیاری ہوتے ہیں۔ لہٰذا ایمان لاتے وقت آدمی محبتِ عقلی کا مکلف ہو گا بعد میں جب محبتِ عقلی میں طبعی رنگ آ جائے گا تو یہی عقلی محبت طبعی محبت بن جائے گی، یوں کہہ سکتے ہیں کہ طبیعتِ ثانیہ بن جائے گی، لیکن بنیاد اور آغاز میں محبت عقلی ہی ہوتی ہے۔ بہت ساری چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو ابتداءً عقلی ہوتی ہیں لیکن بعد میں انسان کی طبیعتِ ثانیہ بن جاتی ہیں، ایسے امور در حقیقت ہوتے عقلی ہی ہیں لیکن اس طرح راسخ ہو جاتے ہیں کہ طبیعت میں شامل ہو جاتے ہیں کیونکہ انہیں مسلسل کرتے کرتے انسان کے لئے انہیں کرنا ایسا ہی آسان ہو جاتا ہے جیسے اس کے

لئے امورِ عادیہ آسان ہوتے ہیں، ہاں اِن میں اور اصل امورِ عادیہ میں فرق یہ ہوتا ہے کہ اول الذکر امور اختیاری ہوتے ہیں۔ بہر حال ہمارے نزدیک دونوں طرف کے حضرات حق پر ہی ہیں۔

متن: (اَلْعُطُوْرُ الْمَجْمُوْعَةُ)

آپ ﷺ کی محبوبیتِ عامہ کی ایک اور لطیف وجہ:

امت کے علماءِ ربانیین اور عارفین صحیح احادیث کی روشنی میں فرماتے ہیں کہ کل کائنات کی اصل نورِ محمدی ﷺ ہے۔ اسی نور سے تمام کائنات کو وجود بخشا گیا ہے۔

چنانچہ حضرت جابر بن عبد اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے بارگاہ نبوی ﷺ میں عرض کیا: یا رسول اللہ (ﷺ) یہ بتلائیے کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے کس شے کو پیدا کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اے جابر اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے اپنے نور سے (یعنی اپنے نور کے فیض سے) تمہارے نبی کے نور کو پیدا کیا"

تشریح:

یہاں غور فرمائیں کہ حضرت نے حدیث کی تشریح کرتے ہوئے فوراً فرمایا دیا کہ "اپنے نور سے پیدا کیا" کا مطلب یہ ہے کہ "نور کے فیض سے پیدا کیا"۔ کیونکہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ "اپنے نور سے پیدا کیا" کا مطلب یہ ہے کہ نبی ﷺ اللہ کے نور کا ایک جز ہیں۔ حضرت نے اس کی وضاحت فرما دی، کیونکہ عقیدہ کی بات سب سے اہم ہوتی ہے۔ اپنے عقیدہ کو سلامت رکھنا چاہیے۔

متن: (اَلْعُطُوْرُ الْمَجْمُوْعَةُ)

پھر تمام کائنات کا وجود ہوا۔ اب کائنات کی ہر شے کو اپنی اصل کی جانب جذب و کشش ایک فطری اور طبعی تقاضا ہے جو ہر موجود میں پایا جاتا ہے۔ جن لوگوں نے اپنی فطرت کو زنگ آلود کر لیا ان کا یہ احساس بھی معدوم ہو گیا۔ آخر زمانہ میں جب قلوب سے صلاحیت ختم ہو جائے گی اور اسلام کی صلاحیت اور استعداد مفقود ہو جائے گی تو پھر اسلام اور ایمان ساری دنیا سے سمٹ کر اپنے اصلی مرکز میں محدود ہو جائے گا۔ جیسے بخاری شریف میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے کہ بے شک اسلام مدینہ کی طرف

ایسا کھنچ آئے گا جیسے سانپ اپنے سوراخ کی طرف کھنچ آتا ہے۔

کائنات کے ظہور کو حضراتِ عارفین نے مسلم شریف کی اس حدیث سے سمجھا ہے کہ فرمایا رسول اللہ ﷺ نے: "اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی جَمِیْلٌ" ترجمہ: "اللہ تعالیٰ جمیل ہے"۔

اور جمال کے لئے ظہور مناسب ہے اور اللہ تعالیٰ چونکہ حکیم بھی ہیں اس لئے حکمت کا تقاضا ہوا کہ ذات و صفات کا ظہور فرماویں اور ذات و صفات کا ظہور ہوتا ہے افعال سے، جن کا تعلق تخلیق سے ہے اور اسی ظہور سے معرفت ہو سکتی ہے، اسی ظہور کے اِقتضاء یعنی چاہنے کو حُبّ سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ عارفین اسی حُبّ کو اصطلاح میں تعیُّنِ اوّل اور حقیقتِ محمدیہ بھی کہتے ہیں

تشریح:

تعیُّنِ اوّل یعنی پہلی چیز جسے اللہ تعالیٰ نے وجود دیا ہوا ہے۔

متن: (اَلْعُطُوْرُ الْمَجْمُوْعَۃُ)

"جو کہ ساری مخلوق کی اصل قرار دی گئی ہے۔ لہٰذا سید الکونین ﷺ کی محبوبیتِ عامہ کا اثر انسانوں سے گزر کر حیوانوں اور جمادات نباتات تک پہنچ گیا۔ البتہ جو مریضِ قلب شقاوتِ ازلی کی وجہ سے جانوروں اور پتھروں سے بھی گئے گزرے ہیں ان میں نہیں آیا۔ حجۃ الوداع میں سید الکونین حبیب خدا ﷺ کے دستِ مبارک سے قربان ہونے کے لئے قربانی کے وقت اونٹوں کا ایک دوسرے سے بڑھ کر پیش ہونا کہ ہر ایک جلدی قربان ہونا چاہتا تھا اور زبانِ حال سے کہتا تھا

سر بوقتِ ذبح اپنا ان کے زیرِ پائے ہے
یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

اور کھجور کے تنہ اسطوانۂ حنّانہ کا حضور اقدس ﷺ کی جدائی میں اس زور سے رونا کہ مسجد گونج گئی۔ درختوں کا حضور ﷺ کو بارہا سلام کرنا اور آپ کی رسالت کی شہادت دینا۔ حضور اقدس ﷺ کے غلاموں کے لئے جنگلی درندوں کا مطیع ہونا اور ان کے لئے دریاؤں کا مسخر ہونا وغیرہ بے شمار واقعات جو کتبِ احادیث میں مشہور ہیں اسی محبوبیتِ عامہ کا پتا دیتے ہیں۔ بخاری و مسلم میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جبلِ

اُحد کی طرف اشارہ کر کے فرمایا:

"هٰذَا جَبَلٌ يُّحِبُّنَا وَنُحِبُّهٗ"

ترجمہ: "یہ پہاڑ ہم سے محبت رکھتا ہے اور ہم اس سے محبت رکھتے ہیں"۔

تشریح:

دو قسم کی مخلوقات ہیں۔ (1) مکلّف مخلوقات۔ (2) غیر مکلّف مخلوقات۔ مکلّف مخلوقات کے ذمہ لازم ہے کہ وہ اختیاری طور پر وہ اسباب اختیار کر لیں جن سے انہیں اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل ہو۔ ایسا کرنے میں نفس کی طرف سے رکاوٹ پیش آتی ہے، یہ ایک طبعی رکاوٹ ہے۔ اس طبعی رکاوٹ کو دور کرنے کے لئے عقلی کاوش اور محنت کی ضرورت پڑتی ہے۔ جب مکلّف مخلوقات وہ محنت و کوشش کرتی ہیں تو اللہ اور اللہ کے رسول کی وہ محبت جو انسان کے اندر دبی ہوئی ہے وہ باہر آ جاتی ہے۔ اگر یہ کوشش و محنت نہ کی جائے تو وہ محبت دبی رہتی ہے۔ جبکہ غیر مکلف مخلوقات میں یہ چیز نہیں ہے۔ وہ اپنی جبلت پر عمل کرتی ہیں اور غیر مکلّف مخلوقات میں چونکہ نفس نہیں ہوتا اس لئے ان کی جبلت کے اندر موجود محبت کے اظہار میں کوئی رکاوٹ آڑے نہیں آتی۔ اسی وجہ سے اونٹوں نے اپنی جان قربان کرنے کا مظاہرہ کیا اور استوانۂ حنانہ نبی ﷺ کے فراق کے غم میں پھوٹ پھوٹ کر رویا۔

مکلّف مخلوقات اس پر مامور ہیں کہ وہ اس رکاوٹ کو دور کر کے اپنی اصلاح کریں اور اس چیز کو باہر لائیں جو جبلت کے اندر دبی ہوئی ہے۔

اسی وجہ سے حضرت نے فرمایا کہ یہ عنصر صرف ان لوگوں میں نہیں پایا جاتا جنہوں نے اپنی نفس کی خواہشات میں اپنے آپ کو اتنا سرگرداں کر دیا کہ ان کے دل پتھر ہو گئے۔ در اصل نفس میں دو چیزیں آ سکتی ہیں اور دل میں بھی دو چیزیں آ سکتی ہیں۔ نفس فجور اور تقویٰ کا مقام ہے جبکہ دل الہامِ رحمانی اور وسوسۂ شیطانی کا مقام ہے۔ دونوں مقامات میں اپنی اپنی دونوں چیزیں آ رہی ہوتی ہیں۔ انسان اپنے اختیار سے جس چیز کو لیتا ہے اسے اسی چیز کے نتائج ملتے ہیں۔ نفس ہر دم فجور اور تقویٰ کی کشمکش میں ہوتا ہے اس کے سامنے فجور کے کام بھی آ رہے ہوتے ہیں اور تقویٰ کے بھی۔ اگر وہ نفس اصلاح کی طرف مائل ہے تو تقویٰ کے کام اختیار کرتا ہے وگرنہ فجور

کی طرف چلا جاتا ہے۔ اسی طرح دل میں بھی اللہ پاک کی طرف سے الہامات آ رہے ہیں اور شیطان کی طرف سے وساوس بھی۔ اللہ تعالیٰ کی سنت عادیہ ہے کہ جو کسی چیز کو جتنا زیادہ اختیار کرتا ہے اس کی ضد اتنی کم ہوتی جاتی ہے۔ اب اگر کسی نے ایک فیصد تقویٰ اختیار کیا تو اس میں سے ایک فیصد فجور کم ہو گیا، اسی طرح کسی نے ایک فیصد فجور اختیار کر لیا تو ایک فیصد تقویٰ کم ہو گیا۔ کسی نے شیطانی چینل پر لبیک کہا تو اس کے لئے شیطانی چینل مزید کھل جائے گا اور رحمانی چینل تھوڑا سا بند ہو جائے اگر پہلے دونوں پچاس پچاس فیصد تھے تو اب شیطانی چینل 51 فیصد ہو جائے گا اور رحمانی چینل 49 فیصد ہو جائے گا۔ اس کے بعد اگر وہ شیطانی چینل کی طرف بڑھتا گیا تو ہوتے ہوتے ایک دن اس کے نفس و قلب پر مکمل طور پر شیطان چھا جائے گا اور وہ ہلاک ہو جائے گا۔ ایسے ہی لوگوں کے لئے اللہ پاک نے ارشاد فرمایا ہے:

﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَ عَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَ عَلٰۤى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۫ وَّ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ﴾ (البقرہ: 7)

ترجمہ: "اللہ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر مہر لگادی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے اور ان کے لیے زبردست عذاب ہے"۔

ایسے ہی لوگوں کی مثال جانوروں سے دی گئی ہے:

﴿اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ﴾ (الاعراف: 179)

ترجمہ: "وہ لوگ چوپایوں کی طرح ہیں، بلکہ وہ ان سے بھی زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں"۔

دوسری طرف اگر انسان محنت کرے اور خیر کی آواز پہ لبیک کہے تو پھر رحمانی چینل کھلتا جائے گا اور شیطانی چینل کمزور ہوتا ہوتا آخر کار مکمل طور پر بند ہو جائے گا اور رحمانی چینل مکمل طور پر کھل جائے گا۔ ایسے لوگوں کے لئے اللہ پاک نے فرمایا ہے:

﴿اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَكَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ﴾ (الحجر: 42)

ترجمہ: " یقین رکھو کہ جو میرے بندے ہیں، ان پر تیرا کوئی زور نہیں چلے گا"۔

یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے واقعی اپنے اوپر محنت کر کے شیطانی چینل کی اپنے تک رسائی بند کر دی۔ جبکہ کچھ لوگوں نے دوسری طرف محنت کر کے رحمانی چینل بند کر لیا ہے۔ ایسے لوگوں کے لئے دوبارہ اس چینل کو کھولنے کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنی

اصلاح کروا لیں۔ ابھی بھی اللہ و رسول ﷺ کی محبت ان کے اندر موجود ہے، وہ مادہ ان کے اندر موجود ہے لیکن یہ تب تک اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے جب تک رکاوٹیں دور نہ کر لیں۔ انسان کے اندر دبی اس محبت و جذب کو جگانے کے لئے تصوف میں فاعلات و مراقبات ہیں جبکہ نفس کی رکاوٹ کو دور کرنے کے لئے مجاہدات ہیں۔ خصائل (اچھی عادات) کو ابھارنے کے لئے فاعلات کروائے جاتے ہیں اور برائیوں کو دبانے کے لئے مجاہدات کروائے جاتے ہیں۔ بری چیزوں کو دبانا ہوتا ہے، اس کے لئے مجاہدہ ہے اور اچھی چیزوں کو ابھارنا ہوتا ہے، اس کو فاعلہ کہتے ہیں۔ انہی دو چیزوں (فاعلات اور مجاہدات) سے انسان کی اصلاح ہوتی ہے۔ یہ شیخ کی صوابدید اور تجربہ پر منحصر ہوتا ہے کہ وہ کس وقت سالک کو فاعلہ پر لگائے، کس وقت مجاہدہ پر لگائے اور کس ترتیب سے لگائے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی اصلاح فرمائ

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

تعلیمات مجددیہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَ الصَّلٰوۃُ وَ السَّلَامُ عَلٰی خَاتَمِ النَّبِیِّیْنَ

اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

تعلیمات میں سب سے زیادہ اہمیت عقائد کی ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی نے ارشاد فرمایا ہے کہ تصوف کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ معتقداتِ شرعیہ پر یقین مضبوط ہو جائے اور شریعت پر عمل آسان ہو جائے۔ سب سے پہلے عقیدے کا نمبر آتا ہے۔ اگر عقیدہ صحیح نہیں ہے تو سب کچھ گڑ بڑ ہے کیونکہ عقیدے کی درستگی کے بغیر کوئی عمل قبول ہی نہیں ہو گا۔ حضرت کے جو دو مکتوبات شریفہ پہلے بیان کئے گئے وہ عوام کے لئے تھے اس لئے حضرت نے ان میں طرز تحریر آسان اور مختصر رکھا جبکہ مکتوب نمبر 266 جس کے دروس جاری ہیں، یہ مکتوب حضرت نے اپنے شیخ حضرت خواجہ باقی باللہ کے صاحب زادگان کو لکھا تھا۔ اس مکتوب میں حضرت مجدد الفِ ثانی نے ان عقائد پر تفصیلی گفتگو کی ہے جو تصوف میں زیر بحث آتے ہیں۔ یہ حضرات خود اعلیٰ پائے کے صوفیا تھے اور تصوف کی اصطلاحات اور ابحاث سے خوب واقف تھے اس لئے حضرت نے اس مکتوب میں خوب تفصیلی اور علمی انداز میں بات کی ہے، اس وجہ سے یہ مکتوب شریف کافی طویل ہے۔ آج کے درس کا آغاز ہم عقیدہ نمبر 10 سے کر رہے ہیں۔

متن:

عقیدہ: 10

اور حق تعالیٰ خیر و شر کا ارادہ کرنے والا بھی ہے اور دونوں (خیر و شر) کا پیدا کرنے والا بھی، لیکن وہ خیر سے راضی ہوتا ہے اور شر سے ناراض۔ ارادہ اور رضا کے درمیان یہ ایک بڑا باریک اور دقیق فرق ہے جس کی طرف حضرت حق سبحانہٗ و تعالیٰ نے اہلِ سنت کو ہدایت عطا فرمائی ہے۔ باقی تمام فرقے اس فرق کو نہ سمجھنے کی وجہ سے

گمراہی میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ اسی وجہ سے معتزلہ نے بندے کو اپنے افعال کا خالق کہا ہے اور کفر و معاصی کی ایجاد کو اس (بندے) سے منسوب کیا ہے۔ شیخ محیُ الدین (ابن عربی) اور ان کی پیروی کرنے والوں کے کلام سے یہ مفہوم پیدا ہوتا ہے کہ جس طرح ایمان و عملِ صالح اسم "اَلْهَادِیُ" کے پسندیدہ ہیں اسی طرح کفر و معاصی بھی اسم "اَلْمُضِلُّ" کے پسندیدہ ہیں۔ (شیخ کی) یہ بات بھی اہل حق کے خلاف ہے اور ایجاب کی طرف میلان رکھتی ہے جو رضا کا منشا ہوئی ہے۔ جیسا کہ کہتے ہیں کہ آفتاب کا کام ضو فشانی (روشنی پھیلانا) ہے اور اس میں اس کی مرضی شامل ہے۔ اور حضرت حق سبحانہٗ و تعالیٰ نے اپنے بندوں کو قدرت و ارادہ عطا کیا ہے کہ وہ اپنے اختیار سے اپنے افعال کا کسب کرتے ہیں۔ افعال کا پیدا کرنا حق سبحانہٗ و تعالیٰ کی طرف منسوب ہے اور ان افعال کا کسب بندوں کی جانب منسوب ہے۔ اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ کی عادت اسی طرح جاری ہے کہ بندہ جب اپنے فعل کا ارادہ کرتا ہے تو حضرت حق سبحانہٗ و تعالیٰ اس فعل کو پیدا کر دیتا ہے۔ چونکہ بندے کا فعل اپنے اختیار سے صادر ہوتا ہے اس لئے لازمی طور پر اس کی تعریف اور برائی، ثواب اور عذاب بھی اسی سے متعلق ہو جاتا ہے۔

جنہوں نے یہ کہا ہے کہ بندے کا اختیار کمزور اور ضعیف ہے اگر حق سبحانہٗ کی قوتِ اختیار کے اعتبار سے (اس بندے کے اختیار) کو ضعیف کہا ہے تو مسلم ہے، اور اگر اس معنی میں کہا گیا ہے کہ جس کام کے کرنے میں اس کو مامور کیا گیا ہے وہ (قوت و اختیار) کافی نہیں ہے، تو پھر یہ بات صحیح نہیں: "فَاِنَّ اللّٰهَ سُبْحَانَهٗ لَا یُكَلِّفُ بِمَا لَیْسَ فِیْ وُسْعِهٖ بَلْ یُرِیْدُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ الْعُسْرَ" "پس بے شک اللہ جل شانہٗ ایسے کام کی تکلیف نہیں دیتا جو بندے کی وسعت سے باہر ہو بلکہ وہ تو آسانی کا ارادہ کرتا ہے اور تنگی کا ارادہ نہیں کرتا"۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ "فعل موقت" (چند روزہ زندگی کے فعل) پر جزائے مُخَلَّدُ (دائمی عذاب) کا مقرر کرنا حق تعالیٰ کے حوالہ ہے اور جس نے "کفر موقت" کی سزا اس کے اعمال کے موافق "عذاب مخلد" فرمائی اور "تلذذات دائمی" (یعنی بہشت اور جو کچھ اس میں ہے) کو "ایمان موقت" (زندگی بھر کے ایمان پر وابستہ کر دیا، ﴿ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ﴾ (الأنعام: 96) "یہ عزیز و علیم کا مقرر کردہ ہے"۔ اللہ سبحانہ کی توفیق

سے اس قدر ہم جانتے ہیں کہ حضرت حق سبحانہ و تعالیٰ جو ظاہری اور باطنی نعمتوں کا دینے والا اور آسمان و زمین کا پیدا کرنے والا ہے اور جس کی بارگاہ اقدس کے لئے ہر قسم کی بزرگی اور کمال ثابت ہے، اس کی نسبت کفر اختیار کرنے کی سزا بھی ایسی ہی ہونی چاہیے جو سخت ترین سزاؤں میں سے ہو، اور وہ ہمیشہ عذاب میں رہنا ہے۔ اور اسی طرح اس منعم بزرگ و برتر پر ایمان بالغیب لانا اور نفس و شیطان کی مزاحمت کے باوجود اس کو راست گو جاننے کی جزا بھی ویسی ہی ہونی چاہیے جو سب جزاؤں سے بہتر اور اعلیٰ درجے کی ہو اور وہ دائمی نعمت و لذات میں رہنا ہے۔

بعض مشائخ نے فرمایا ہے کہ "در حقیقت بہشت میں داخل ہونا محض حق سبحانہٗ کے فضل پر موقوف ہے، اور اس کو ایمان کے ساتھ مربوط کرنا اس وجہ سے ہے کہ اعمال کی جزا لذیذ ترین معلوم ہو"۔ لیکن اس فقیر کے نزدیک حقیقتاً بہشت میں داخل ہونا ایمان کی وابستگی پر موقوف ہے لیکن ایمان بھی اس سبحانہٗ و تعالیٰ کا فضل اور عطیہ ہے، اور جہنم میں داخل ہونا کفر کے ساتھ وابستہ ہے اور کفر نفس امارہ کی خواہشات سے پیدا ہوتا ہے: ﴿مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ﴾ (النساء: 79) "جو کچھ بھلائی تجھ کو پہنچتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور جو کچھ برائی تجھ کو پہنچتی ہے وہ تیرے نفس کی طرف سے ہے"۔

جاننا چاہیے کہ بہشت کے داخلے کو ایمان کے ساتھ مربوط کرنا حقیقت میں ایمان کی تعظیم اور تکریم ہے بلکہ "**مُؤْمَنٌ بِهٖ**" (جس پر ایمان لایا گیا) کی تعظیم ہے، جس پر اس قدر بڑا اور عظیم الشان اجر مرتب ہوا ہے۔ اس طرح دوزخ میں داخل ہونے کو کفر کے ساتھ وابستہ کرنے میں کفر کی تحقیر ہے اور اس ذات کی تعظیم ہے جس کی نسبت یہ کفر وقوع میں آیا اور اس طور پر دائمی عذاب اس پر مترتب ہوا، بر خلاف اس بات کے جو بعض مشائخ نے کہی ہے وہ اس دقیقہ سے خالی ہے۔ نیز دوزخ میں داخل ہونا بھی انصاف کے تقاضے پر ہے اور کوئی مثال اس طرح پر جاری نہیں ہے۔ کیونکہ جہنم میں داخل ہونا حقیقت میں کفر کے ساتھ مربوط ہے۔ "**وَاللّٰهُ سُبْحَانَهُ الْمُلْهِمُ**" "اور اللہ سبحانہ ہی الہام فرمانے والا ہے"۔ اس کو یاد رکھیں۔

تشریح:

یہ تقدیر کے متعلق بات ہو رہی ہے۔ اللہ جل شانہ خیر و شر کا ارادہ فرماتا ہے اور خیر و شر کا خالق بھی وہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ کے علاوہ کوئی اور پیدا کرنے والا نہیں ہے۔ اللہ پاک کی صفاتِ ثبوتیہ میں سے ایک صفت "ارادہ" بھی ہے اور ایک صفت "خالق" بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ جس طرح انسانوں، جنات اور فرشتوں وغیرہ کا خالق ہے اسی طرح سب کے اعمال کا خالق بھی وہی ہے۔ بندہ جو کچھ کرتا ہے حقیقت میں اس کا فاعل اللہ جل شانہ ہی ہے، مثلاً میں کھانا کھاتا ہوں، یہ میں تب کھا سکوں گا جب اللہ پاک کی طرف سے مجھ سے اس فعل کے صدور کا ارادہ ہو گا، اگر اللہ پاک نہیں چاہے گا تو میں نہیں کھا سکوں گا۔ اگر اللہ پاک کا ارادہ نہ ہو تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ کوئی کھا سکے۔ اسی طرح اگر کوئی (نَعُوذُ بِاللهِ مِنْ ذَالِكَ) شراب پیتا ہے تو یہ جرم ہے، اگر اللہ پاک قاہرانہ فیصلہ کر لے اور اس کو نہ پینے دے تو وہ نہیں پی سکتا۔

لاہور کے ایک بزرگ کے بارے میں مجھے I-8/4 کے رہنے والے ان کے ایک مرید نے بتایا کہ ایک شاعر سے حضرت ملنا چاہتے تھے، لیکن اس شاعر نے ملنے سے پہلے ایک شرط رکھی کہ میں اُن سے تب ملوں گا جب وہ مجھے وسکی پلائیں گے۔ حضرت نے منظور کر لیا کہ ٹھیک ہے، میں پلاؤں گا۔ لوگ حیران تھے کہ کتنی عجیب بات ہے کہ حضرت نے وسکی پلانا قبول کر لیا، یہ کیسے بزرگ ہیں؟ خیر! وہ شاعر ملاقات کے لئے آگیا اور حضرت نے وسکی کا پیالہ اس کے سامنے رکھ دیا۔ باتیں ہوتی رہیں، آخر میں بزرگ نے کہا کہ وسکی آپ کے سامنے رکھی ہوئی ہے، آپ پیتے کیوں نہیں؟ اس نے غصے سے کہا: حضرت! یہ عجیب بات ہے کہ آپ پلا بھی رہے ہیں اور مجھے گلاس اٹھانے بھی نہیں دے رہے، میں ارادہ کرتا ہوں لیکن اٹھا نہیں پا رہا۔

یہ اس اللہ کے ولی کی کرامت تھی۔ کرامت، اللہ کا فعل ہوتا ہے، ولی کا فعل نہیں ہوتا، البتہ ولی کے ہاتھ پہ ظاہر ہوتا ہے۔ اس شاعر کا شراب نہ پی سکنا اس وجہ سے تھا کہ اللہ کا ارادہ نہیں تھا کہ وہ شراب پیے، اس لیے وہ چاہنے کے باوجود شراب نہیں پی سکا۔ معلوم ہوا کہ اگر اللہ جل شانہ نہ چاہے تو ہم نہ کھانا کھا سکیں، نہ پانی پی سکیں اور نہ ہی بات کر سکیں۔

اس حوالے سے ایک بات یاد آئی، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی صاحب نے اپنے ایک وعظ میں بڑا تفصیلی کلام فرمایا ہے کہ ایک صاحب مرتد ہو گئے، ان کے ایک دوست نے ان کے ارتداد کے با وجود ان سے قطع تعلق نہیں کیا بلکہ اپنے ساتھ ساتھ رکھتے تھے۔ ایک دن مولانا فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی کی زیارت کو جانے لگے تو اس (مرتد) دوست سے پوچھا کیا آپ چلیں گے؟ اس نے جواب دیا کہ وہ تمہارا بزرگ ہے میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے، میں کیوں جاؤں؟ انہوں نے کہا کہ لوگ سیر و تفریح کے لئے بھی تو جاتے ہیں، آپ سیر و تفریح سمجھ کر ہمارے ساتھ چلیں، آپ کی سیر ہو جائے گی اور ہمارا کام ہو جائے گا۔ وہ صاحب مان گئے لیکن سمجھ بھی گئے کہ مجھے کیوں لے جا رہے ہیں، بعد میں یہ صاحب مسلمان ہو گئے تھے اور "کفر توڑ" نامی کتاب بھی لکھی جس میں یہ پورا واقعہ نقل کیا ہے۔ اس کتاب میں لکھتے ہیں کہ میں راستہ بھر یہ سوچتا رہا کہ حضرت یہ پوچھیں گے تو میں یہ جواب دوں گا، یہ پوچھیں گے تو میں یہ جواب دوں گا اور یہ کہیں گے تو میں یہ جواب دوں گا وغیرہ وغیرہ۔ گویا انہوں نے پورا گورکھ دھندا بنایا ہوا تھا کہ میں نے یہ کام کرنا ہے۔ جب وہاں پہنچے اور حضرت سے گفتگو کا موقع آیا تو حضرت نے پوچھا "بھئی کون ہو، کہاں سے آئے ہو، کس لئے آئے ہو؟"۔ حضرت تیز تیز بولتے تھے جس کی وجہ سے بات کرتے ہوئے تھوڑی سی لکنت ہوتی تھی۔ خیر! وہ مسلسل یہی بات پوچھتے جا رہے تھے اور یہ بالکل گم صم کھڑے تھے۔ کچھ کہہ ہی نہیں پا رہے تھے۔ آخر میں جواب دیا کہ حضرت بیعت ہونے آیا ہوں، مجھے بیعت فرما لیں۔ حضرت نے ان کو بیعت کر لیا اور چونکہ بیعت میں ایمان کے الفاظ ہوتے ہیں اور کلمہ طیبہ بھی پڑھایا جاتا ہے لہذا انہوں نے کلمہ بھی پڑھ لیا اور مسلمان ہو گئے۔ واپسی پر ان کے دوستوں نے پوچھا کہ پہلے تو تم آ ہی نہیں رہے تھے اور جب آئے تو پھر بیعت بھی ہو گئے؟ یہ کیا ماجرا ہے؟ انہوں نے کہا کہ میرے ساتھ جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ میں نے بڑی لمبی کہانی بنائی تھی کہ میں ان کے سوالوں کے فلاں فلاں جواب دوں گا لیکن جس وقت میں حضرت کے سامنے گیا تو بالکل ہکا بکا ہو گیا، ایسا لگا جیسے میرے دماغ میں کچھ ہے ہی نہیں، سب کچھ ختم ہو گیا ہے۔ اس کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ میرے دماغ میں ایک سکرین بن گئی ہے جس پر ایک طرف وہ سب سوال ایک ایک کر کے آ رہے ہیں جو میں نے ذہن

میں رکھے ہوئے تھے کہ حضرت سے پوچھوں گا اور دوسری طرف ان کے جوابات آ رہے ہیں۔ آپ لوگ حضرت کی باتیں سن رہے تھے اور میں وہ سوال و جواب دیکھ رہا تھا۔ مجھے میرے سب سوالوں کے جواب مل گئے اور دل میں ایمان آ گیا تو میں نے حضرت سے کہہ دیا کہ میں بیعت ہونے کے لئے آیا ہوں، آپ بیعت فرما لیں، اور بیعت ہو گیا۔ دیکھیے! یہ بھی ولی اللہ تھے، ان کے ہاتھ پہ بھی کرامت صادر ہوئی لیکن اصل فعل تو اللہ تعالیٰ کا ہی تھا، اللہ تعالیٰ نے نہیں چاہا تو وہ صاحب بول ہی نہیں سکے، دلائل دینا تو دور کی بات ہے۔ اور جب بولے تو یہ بولے کہ بیعت ہونے کے لئے آیا ہوں۔ یہ بالکل وہی بات ہے جو سورۃ کوثر کے نزول کے وقت ہوئی تھی۔ کفار اس کا جواب دینے کے لئے کوششوں میں لگے رہے کہ اس جیسی کوئی سورہ بنا لیں لیکن کوئی نہیں بنا سکا، حالانکہ یہ صرف 3 آیات پر مشتمل ایک چھوٹی سی سورہ ہے۔ کافی عرصہ کوششیں کرنے کے بعد ایک شاعر نے صرف یہ لکھا کہ "مَاهٰذَا قَوْلُ الْبَشَرِ" "یہ بشر کا کلام نہیں ہے"۔ یعنی یہ مِن جانب اللہ ہے۔ اللہ پاک اگر قاہرانہ فیصلہ فرما دیں تو کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ قاہرانہ فیصلے کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص ایک کام کرنا چاہے لیکن اللہ پاک اس کو ہونے نہ دے۔ کبھی کبھار اللہ پاک اپنی قدرت کو ظاہر فرماتے ہیں لیکن اللہ پاک کی حکمت اس میں نہیں ہے۔ اللہ پاک کی حکمت یہ ہے کہ وہ اپنے بندوں کو اختیار دیتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ (البقرۃ: 286)

ترجمہ: "اللہ کسی بھی شخص کو اس کی وسعت سے زیادہ ذمہ داری نہیں سونپتا"۔

اللہ اس اختیار کے بعد ہدایت بھی دیتا ہے، صحیح بات بھی سامنے رکھ دیتا ہے۔ غلط بات تو آدمی کے نفس کے اندر پہلے سے ہی موجود ہے، غلط محبت پہلے سے ہی دل کے اندر موجود ہوتی ہے، تو اس کی وجہ سے غلط سوچیں وغیرہ دماغ کے اندر آتی ہیں، اللہ تعالیٰ اختیار دے کر صحیح بات بھی بتا دیتا ہے، اب بندے کے اختیار میں ہوتا ہے کہ وہ اس ہدایت کو مانتا ہے جو انبیائے کرام، علمائے کرام اور کتابوں کے ذریعے سے اس تک پہنچی ہے یا اپنے نفس کی بات مانتا ہے۔ آپ صبح نماز پڑھنے کے لئے جاگنا چاہتے ہیں یا نہیں جاگنا چاہتے، اس کا آپ کو اختیار ہے، اللہ تعالیٰ زبردستی نماز نہیں پڑھواتا،

ہاں جو پڑھ لیتا ہے اس کو اجر دیتا ہے اور جو نہیں پڑھتا اس کو سزا دیتا ہے۔ اسی طرح دوسرے معاملات میں مکمل اختیار دیا ہے کہ حلال بھی کھا سکتے ہو اور حرام بھی کھا سکتے ہو، حلال کھاؤ گے تو فائدہ ہو گا، حرام کھاؤ گے تو سزا ہو گی۔ جھوٹ بھی بول سکتے ہو، سچ بھی بول سکتے ہو، جھوٹ بولو گے تو گناہ ہو گا، سچ بولو گے تو فائدہ ہو گا۔ اللہ خیر سے راضی ہوتا ہے اور شر سے ناراض ہوتا ہے۔

اللہ کے ارادے اور اللہ کی رضا کے درمیان فرق یہ ہے کہ اللہ خیر و شر دونوں کا ارادہ فرماتے ہیں البتہ راضی صرف خیر کے کام سے ہوتے ہیں۔ یہ ارادہ ہے کہ بندہ جو کرے گا وہی ہو گا لیکن اگر وہ غلط کرے گا تو اس پر اللہ راضی نہیں ہوں گے۔

متن:

ارادے اور رضا کے درمیان یہ بہت باریک اور دقیق فرق ہے جس کی طرف حضرت حق سبحانہٗ و تعالیٰ نے اہلِ سنت کو ہدایت فرمائی ہے، باقی تمام فرقے اس فرق کو نہ سمجھنے کی وجہ سے گمراہی میں مبتلا ہو گئے۔ اس وجہ سے معتزلہ نے بندے کو اپنے افعال کا خالق کہا ہے (اور اس کے مقابلے میں جبریہ نے کہا ہے کہ بندہ مجبور محض ہے) اور کفر و معاصی کی ایجاد کو معتزلہ نے اس (بندے) سے منسوب کیا ہے۔ شیخ مُحی الدین ابن عربی اور ان کی پیروی کرنے والوں کے کلام سے بھی یہ مفہوم پیدا ہوتا ہے کہ جس طرح ایمان و عمل صالح اسم "**اَلْهَادِیُ**" کے پسندیدہ ہیں اسی طرح کفر و معاصی بھی اسم "**اَلْمُضِلُّ**" کے پسندیدہ ہیں" (شیخ کی) یہ بات بھی اہل حق کے خلاف ہے اور ایجاب کی طرف میلان رکھتی ہے۔ جو رضا کا منشا ہوئی ہے۔

تشریح:

رضا سے مراد یہ ہے کہ اللہ پاک اس سے راضی ہے لیکن یہ اس بندے کے اختیار کے بعد کی بات ہے۔

متن:

آفتاب کا کام ضو فشانی (روشنی پھیلانا) ہے اور اس میں اس کی مرضی شامل ہے۔ اور حضرت حق سبحانہٗ و تعالیٰ نے اپنے بندوں کو قدرت و ارادہ عطا کیا ہے کہ اپنے اختیار

سے اپنے افعال کا کسب کرتے ہیں۔ افعال کا پیدا کرنا حق سبحانہٗ کی طرف منسوب ہے اور ان افعال کا کسب بندوں کی جانب منسوب ہے۔

تشریح:

یعنی کسب بندے کی طرف سے ہوتا ہے چنانچہ فرمایا گیا:

﴿لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ﴾ (البقرۃ: 286)

ترجمہ: "اس کو فائدہ بھی اسی کام سے ہو گا جو وہ اپنے ارادے سے کرے نقصان بھی اسی کام سے ہو گا جو اپنے ارادے سے کرے"۔

لیکن افعال تخلیق اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتے ہیں، ان کو پیدا اللہ تعالیٰ ہی کرتا ہے۔ بندہ تب کسی فعل کا کسب کرتا ہے جب بندے کا ارادہ ہو، اس کے علاوہ ایک ارادہ اللہ تعالیٰ کا بھی ہوتا ہے، وہ بندے کے ارادے سے الگ ہے۔ حضرت نے یہ بات بالکل واضح فرمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فعل کو بندے کے ارادے کے تابع کر دیا ہے یعنی بندہ جو چاہے گا اللہ تعالیٰ ویسے کر لے گا۔ مثال کے طور پر اگر کسی ایسے شخص کا امتحان لینا ہو جو لکھ نہیں سکتا تو اس کے ساتھ کوئی ایسا آدمی بٹھا دیا جاتا ہے جو لکھ سکتا ہے، یہ اس کو بتاتا رہتا ہے اور وہ لکھتا رہتا ہے۔ ساتھ بیٹھنے والے کا کام محض لکھنا ہوتا ہے، پیپر میں معروضی سوالات ہوتے ہیں، لکھنے والا اس سے پوچھتا ہے کہ میں کون سے آپشن پہ ٹک کروں؟ جس آپشن کو منتخب کرنے کے لئے یہ آدمی کہتا ہے لکھنے والا اسی کو ٹک کرنے کا پابند ہوتا ہے۔ وہ یہ نہیں کہتا کہ یہ غلط ہے یا صحیح ہے کیونکہ اس کا امتحان ہو رہا ہوتا ہے۔ اسی طرح اللہ پاک بھی جانتا ہے کہ یہ بندہ غلط کر رہا ہے، لیکن چونکہ اس کا امتحان ہے اس لئے وہ جیسے چاہتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو ویسے کر لیتا ہے اور اس شخص کو ذمہ دار بنا دیتا ہے۔

متن:

چونکہ بندے کا فعل اپنے اختیار سے ہوتا ہے اس لئے لازمی طور پر اس کی تعریف اور برائی، ثواب اور عذاب بھی اسی سے متعلق ہے۔ اور جنہوں نے یہ کہا ہے کہ بندے کا اختیار کمزور اور ضعیف ہے اگر حق سبحانہٗ کی قوتِ اختیار کے اعتبار سے کہا ہے تو یہ ٹھیک ہے۔

تشریح:

یہ جو کہا گیا ہے کہ "بندے کا اختیار کمزور اور ضعیف ہے" اگر اس کا معنی یہ ہو کہ اللہ پاک کی طاقت و قوت کو سامنے رکھ کر دیکھیں تو بندے کا اختیار کمزور اور ضعیف ہے کیونکہ اگر اللہ نہ چاہے تو بندہ کچھ نہیں کر سکتا، تو پھر یہ قول بالکل درست ہے، جیسے حدیث شریف میں ہے کہ اے معاذ! اگر یہ سارے لوگ جمع ہو جائیں اور تجھے کوئی نفع پہنچانا چاہیں اور اللہ کا ارادہ نہ ہو تو یہ نفع نہیں پہنچا سکتے اور اگر یہ سب جمع ہو کر تمہیں کوئی نقصان پہنچانا چاہیں اور اللہ پاک کا ارادہ نہ ہو تو یہ نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ یہ اسی کی طرف اشارہ ہے کہ بندے کا اختیار اللہ کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا۔ لیکن اگر اس قول کا معنی یہ ہو کہ جس کام کے کرنے کے لئے بندے کو مامور کیا گیا ہے اس کام کے لئے اسے ضرورت کے مطابق قوت و اختیار نہیں دیا گیا تو یہ بات صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ اللہ پاک کا یہ طریقہ نہیں ہے۔ اس کو ایک مثال کے ذریعے سمجھا جا سکتا ہے۔ ہمارے محکموں میں یہ قانون ہوتا ہے کہ اگر کسی کو کوئی ذمہ داری ملتی ہے تو اس کے ساتھ اس سے متعلقہ اختیار بھی ملتا ہے۔ اگر کسی کو ذمہ داری دے دی جائے اور اختیار نہ دیا جائے تو وہ شخص کام نہیں کر سکتا۔ اسی طرح جب اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے تو اس کے ساتھ اس کا اختیار بھی دیتا ہے۔ لہٰذا یہ بات درست نہیں ہے کہ بندے کو اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی پر عمل کرنے کے لئے کافی اختیار نہیں دیا گیا۔

متن:

"فَاِنَّ اللّٰهَ سُبْحَانَهٗ لَا يُكَلِّفُ بِمَا لَيْسَ فِيْ وُسْعِهٖ بَلْ يُرِيْدُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ الْعُسْرَ"

"پس بے شک اللہ سبحانہٗ ایسے کام کی تکلیف نہیں دیتا جو بندے کی وسعت سے باہر ہو، بلکہ اللہ تعالیٰ آسانی چاہتا ہے وہ تنگی نہیں چاہتا"۔

تشریح:

اللہ پاک کسی کو ایسے فعل کا مکلف ہی نہیں بناتا جس کی اس کو وسعت حاصل نہ ہو۔

متن:

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ "فعلِ موقت" (چند روزہ زندگی کے فعل) پر "جزائے مخلد"

(دائمی عذاب) کا مقرر کرنا حق تعالیٰ کے حوالے ہے جس نے "کفرِ موقت" کی سزا اس کے اعمال کے موافق "عذاب مُخَلَّدٌ" فرمائی۔ اور "تلذذات دائمی" (یعنی بہشت اور جو کچھ اس میں ہے) کو "ایمان موقت" (زندگی بھر کے ایمان) پر وابستہ کر دیا۔

تشریح:

ایک بات جو الحمد للہ ہمیں پہنچی ہے اور ہمارا خیال ہے کہ یہ بات حضرت مولانا اشرف علی تھانوی صاحب کے مواعظ میں بھی ہو گی۔ وہ بات یہ کہ ایمان کی صفت ہے: "**إِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ وَتَصْدِيقٌ بِالْقَلْبِ**"۔ جب ایک مرتبہ آدمی زبان سے اقرار اور دل سے تصدیق کر لیتا ہے تو کیا اس کے بعد دوبارہ اور سہ بارہ بھی اقرار و تصدیق کرنا پڑتا ہے؟ ہر گز نہیں، اقرار باللسان اور تصدیق بالقلب ایک ہی بار کافی ہوتا ہے۔ اگر ایمان باقی رہے آدمی اسلام پر قائم رہے تو یہ پہلی بار کا اقرار اور تصدیق موت تک باقی رہے گا۔ حتیٰ کہ موت کے بعد بھی اس کا اقرار اور تصدیق جاری رہے گا، اگرچہ یہ آدمی خود نہیں رہا تب بھی اس کا اقرار اور تصدیق باقی رہے گا۔ چونکہ اس کا اقرار اور تصدیق ہمیشہ باقی رہتے ہیں اس لئے اسے ہمیشہ کی جنت ملتی ہے۔ ہاں اگر اس کے کچھ گناہ تھے تو ان کی وجہ سے کچھ دیر کے لئے جنت نہیں ملے گی، اور اس کا وقت اس کے گناہوں کے بقدر ہو گا، جب وہ گناہ ختم ہو جائیں گے تو وہ جنت میں چلا جائے گا اور اس سے کبھی بھی نہیں نکلے گا کیونکہ اب ایمان کی وجہ سے اس کے لئے "خُلودِ فِی الجَنۃ" کا معاملہ شروع ہو گیا ہے۔ دوسری طرف اگر اس نے کفر کیا ہے تو جب تک وہ اقرار نہیں کرے گا اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا، اگر اسی حالت میں موت آ گئی تو اس کا کفر کا اقرار بھی ہمیشہ باقی رہے گا۔

یہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی صاحب کی بات ہے۔ اس طرح کی تجزیاتی باتیں حضرت کی طرف سے ہی ہوتی ہیں۔

اعمال میں ہمیشگی کی صلاحیت نہیں ہے کیونکہ اعمال وقت کے لحاظ سے ہوتے ہیں، مثلاً رمضان شریف آئے گا تو روزے رکھیں گے اور ظہر کی نماز کا وقت داخل ہو گا تو ظہر کی نماز پڑھیں گے وغیرہ وغیرہ۔ ہر چیز کے لئے الگ الگ وقت ہے۔ اس وجہ سے موت کے ساتھ اعمال ختم ہو جاتے ہیں، ہاں اگر کسی نے صدقہ جاریہ وغیرہ شروع

کروایا ہے تو موت کے بعد بھی صدقہ جاریہ کا ثواب ملتا رہے گا۔ حضرت عثمان کا ایک صدقہ جاریہ ابھی تک چل رہا ہے۔ حضرت عمر کا بھی خانہ کعبہ میں ایک صدقہ جاریہ ہے۔

مقصد یہ ہے کہ اگر صدقہ جاریہ ہو تو اس کا ثواب ملتا رہے گا لیکن اس کے اپنے اعمال کا کھاتہ بند ہو جائے گا جب کہ ایمان کے لئے یہ بات نہیں ہے۔ ایمان اور کفر مسلسل ہیں اِلّا یہ کہ درمیان میں تبدیل ہو جائیں۔ اگر تبدیل نہیں ہوئے اور موت آ گئی تو وہ گویا کہ چل رہے ہیں لہٰذا اس کی جزا اور سزا بھی اسی کے حساب سے ملے گی۔ اعمال کی جزا و سزا موقّتُ ہے یعنی جتنا عمل ہو گا اسی حساب سے جزا یا سزا ہو گی۔ البتہ جنت چونکہ ہمیشہ کے لئے ہے اور ایمان بھی موت کے بعد ہمیشہ ہمیشہ رہے گا اس لیے جنت میں مقام تو اعمال کی وجہ سے ہو گا اور خلود ایمان کی وجہ سے ہو گا۔ جیسے ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ (البقرۃ: 257)

ترجمہ: " اللہ ایمان والوں کا رکھوالا ہے"۔

اور دوسری جگہ فرمایا:

﴿اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ۝﴾ (یونس: 62-63)

ترجمہ: "یاد رکھو کہ جو اللہ کے دوست ہیں ان کو نہ کوئی خوف ہو گا نہ وہ غمگین ہوں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے، اور تقوی اختیار کیے رہے"۔

پہلی جگہ پر فرمایا کہ اللہ پاک ایمان والوں کا دوست ہے، اس کے لئے تقویٰ کا ذکر نہیں کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایمان والی ولایت ہر مسلمان کو حاصل ہے، جس کا کوئی عمل بھی نہ ہو، پھر بھی اس کو ایمان کی وجہ سے ہمیشہ کے لئے جنت ملے گی اگرچہ کم سے کم درجہ کی ہو۔ اگر کسی کو اعلیٰ درجے کی جنت ملے گی تو وہ اعمال کی وجہ سے ملے گی اور اس میں ہمیشگی ایمان کی وجہ سے ہو گی۔ یوں سمجھ لیں کہ اگر طول ایمان کے لحاظ سے ہے تو درجہ اعمال کے لحاظ سے ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اونچے مقامات میں سے اونچا مقام نصیب فرمائے۔ ہم تو اللہ تعالیٰ سے آپ ﷺ کے وسیلے سے درخواست ہی

کریں گے، اللہ پاک ہر چیز پر قادر ہیں۔

متن:

اللہ سبحانہ کی توفیق سے اس قدر ہم جانتے ہیں کہ حضرت حق سبحانہ و تعالیٰ جو ظاہری اور باطنی نعمتوں کا دینے والا اور آسمان و زمین کا پیدا کرنے والا ہے اور جس کی بارگاہ قُدُس کے لئے ہر قسم کی بزرگی اور کمال ثابت ہے، اس کی نسبت کفر اختیار کرنے کی سزا بھی ایسی ہی ہونی چاہیے۔

تشریح:

کفر کے بارے میں حضرت نے فرمایا کہ یہ نفس امارہ کی وجہ سے ہوتا ہے اور سو فیصد درست فرمایا ہے۔ ایک دفعہ غالباً حضرت خواجہ نظام الدین اولیا بیمار ہو گئے۔ وہاں ایک جوگی تھا جو توجہ سے بیماری کو جسم سے الگ کر دیتا تھا۔ جب حضرت بے ہوش ہو گئے تو خادمین حضرت کو اس جوگی کے پاس لے گئے۔ حضرت اگر ہوش میں ہوتے تو اجازت نہ دیتے لیکن خادموں نے سوچا کہ ڈاکٹر کافر بھی ہو تو اس سے علاج کروایا جا سکتا ہے۔ خیر! جب لے گئے تو اس جوگی نے توجہ کر کے بیماری سلب کر لی۔ جب حضرت ہوش میں آئے تو پوچھا میں کہاں ہوں؟ جب پتہ چلا کہ جوگی کی کٹیا میں ہوں تو بہت پریشان ہوئے، مریدوں کے ہاتھ پیر بھی کانپنے لگے کہ اب پتا نہیں کیا ہو گا۔ بہر حال! حضرت نے سوچا کہ جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا، اب اس سے کچھ فائدہ اٹھانا چاہیے، چنانچہ آپ نے اس جوگی سے پوچھا کہ یہ زبردست کمال آپ کو کیسے حاصل ہوا؟ اس نے کہا نفس کی مخالفت کی وجہ سے۔ در اصل میں اپنے نفس کی کوئی بات نہیں مانتا۔ پوچھا کیسے مخالفت کرتے ہو؟ جواب دیا کہ نفس کہتا ہے گرم پانی پیو تو میں ٹھنڈا پیتا ہوں اور اگر وہ کہتا ہے ٹھنڈا پیو تو میں گرم پیتا ہوں، وہ اگر کہتا ہے کہ کھڑے ہو جاؤ تو میں بیٹھ جاتا ہوں اور اگر کہتا ہے بیٹھ جاؤ تو میں کھڑا ہو جاتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ یہ واقعی بڑے کمال کی بات ہے، بہر حال! چونکہ آپ نے میرے اوپر احسان کیا ہے اس لئے میں بھی آپ کو کچھ دینا چاہتا ہوں، اس نے کہا ضرور دیجئے۔ آپ نے فرمایا کہ کلمہ پڑھ لو۔ اس نے کہا میں کلمہ تو نہیں پڑھوں گا۔ آپ نے فرمایا کہ اب ذرا اپنی حالت دیکھو۔ اس نے توجہ کی تو پتا چلا کہ ہر چیز سلب ہو چکی ہے، اس نے کہا

آپ نے تو کچھ دینے کا کہا تھا، لیکن آپ نے میرے پاس جو تھا وہ بھی مجھ سے سلب کر لیا۔ حضرت نے فرمایا کہ میں نے سلب نہیں کیا، میں نے آپ ہی کے اصول پر بات کی تھی۔ آپ نفس کی مخالفت کر رہے تھے، جب کہ کلمہ پڑھنے سے آپ کو آپ کا نفس ہی روک رہا تھا اور آپ نے اس کی بات مان لی تھی، اس وجہ سے ہر چیز ختم ہو گئی۔ یہ منطقی جواب وہ سمجھ گیا، اس نے کلمہ پڑھ لیا اور حضرت کا مرید ہو گیا۔ میرے خیال میں غالباً شیخ ہندی انہی جوگی کا لقب ہے جو بعد میں بہت بڑے بزرگ بنے تھے۔

یہی حقیقت ہے کہ کفر نفس امارہ کی وجہ سے ہوتا ہے۔ فرعون بھی اپنے نفس کی وجہ سے مسلمان نہیں ہوا تھا۔ ابو جہل کیوں مسلمان نہیں ہوا؟ حالانکہ وہ آپ ﷺ کو جانتا تھا اور آپ ﷺ کی تمام باتوں کو جانتا تھا لیکن مسلمان نہیں ہوا کیونکہ اس کی انانیت اور "میں" آڑے آ جاتی تھی۔ ایک بار اس نے یہ بھی کہا تھا کہ محمد نے فلاں کام کیا تو ہم نے فلاں کام کیا، انہوں نے یہ کام کیا تو ہم نے وہ کام کیا۔ اب وہ یہ کہتا ہے کہ میں نبی ہوں تو ہم کیسے اس کی بات مانیں؟ ان باتوں سے معلوم ہوا کہ کفر و شرک سب نفس امارہ کی گمراہیاں ہیں۔

متن:

عقیدہ: 11

اور حضرت حق سبحانہٗ و تعالیٰ کو مومنین آخرت میں بے جہت، بے کیف اور بے شبہ و بے مثال جنت میں دیکھیں گے۔

تشریح: یہاں سے حضرت مجدد الفِ ثانی رویتِ باری تعالیٰ کا مسئلہ بیان فرما رہے ہیں۔

متن:

یہ ایک ایسا مسئلہ ہے کہ اہل سنت کے علاوہ تمام اہلِ ملت اور غیر اہلِ ملت سب اس کے منکر ہیں اور بے جہت و بے کیف رؤیت کو جائز نہیں سمجھتے۔ حتیٰ کہ شیخ محی الدین ابن العربی بھی آخرت کی رؤیت کو تجلی صوری کے ساتھ بیان کرتے ہیں اور اس تجلی صوری کے علاوہ کچھ تجویز نہیں کرتے۔

تشریح:

تجلی صوری در اصل عالمِ مثال کی چیز ہے۔

متن:

ایک روز ہمارے حضرت (خواجہ باقی باللہ) نے شیخ سے نقل کیا کہ اگر معتزلہ رؤیت کو تنزیہ کے مرتبہ میں مقید نہ کرتے اور تشبیہ کے بھی قائل ہو جاتے اور اسی رؤیت کو تجلی (صوری) سمجھ لیتے تو ہر گز رؤیت کا انکار نہ کرتے اور محال نہ سمجھتے۔ یعنی ان کا انکار بے جہتی اور بے کیفی کی وجہ سے ہے جو مرتبہ تنزیہ کے ساتھ مخصوص ہے۔ بخلاف اس تجلی کے جس میں جہت اور کیف ملحوظ رکھا جاتا ہے۔

تشریح:

اس عبارت پہ ذرا غور فرمائیں۔ حضرت فرماتے ہیں کہ حضرت خواجہ باقی باللہ نے شیخ ابن العربی سے نقل کیا۔ خود ابن العربی نے کہا کہ اگر معتزلہ رویت کو تنزیہ کے مرتبہ میں مقید نہ کرتے اور تشبیہ مان لیتے تو رویت کا انکار نہ کرتے۔ گویا کہ شیخ اکبر نے اپنی بات کو تشبیہ مان لیا۔ حالانکہ اس میں تو اللہ تعالیٰ کے لئے تشبیہ ہے ہی نہیں بلکہ تنزیہ ہے۔ حضرت فرماتے ہیں کہ:

متن:

یہ بات پوشیدہ نہ رہے کہ آخرت کی رؤیت کو تجلی صوری کی طرح بیان کرنا فی الحقیقت خاص رؤیت کا انکار کرنا ہے کیونکہ وہ تجلی صوری اگرچہ دنیاوی تجلیات صوریہ سے مختلف ہے لیکن حق تعالیٰ کی رؤیت نہیں ہے۔

یَرَاهُ الْمُؤْمِنُوْنَ بِغَیْرِ کَیْفٍ
وَ إِدْرَاکٍ وَّ ضَرْبٍ مِّنْ مِّثَالٍ

جنتی کو دید حق کی ہو گی سیر
کیف و ادراک اور مثالوں کے بغیر

تشریح:

وہ تو مثالی رویت ہے جو شبہ و مثال والی بات ہے۔ یہ ہمارا عقیدہ ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ بغیر کسی کیف اور جہت کے ہم رویت کیسے کریں گے؟ تو وہ اللہ کو پتہ ہے، وہاں یہ بات سمجھ بھی آ جائے گی اور وہاں ان شاء اللہ دیدار بھی ہو جائے گا۔

اُف کیا خوب نظارہ ہو گا
سامنے محبوب ہمارا ہو گا
ہم تو مر مر کے جینا چاہیں گے
اذن جینے کا جو پایا ہو گا

اس شعر کے اندر دو چیزوں کو جمع کیا گیا ہے۔ یعنی محبت اور اللہ جل شانہ کی عظمت کے لحاظ سے تو یہ کیفیت ہو گی کہ مارے خوشی کے ہم مر جائیں لیکن چونکہ جنت میں موت نہیں ہے اس لئے اس قدر اعلی ترین حالت کے باوجود جینا ختم نہیں ہو گا۔

اُف کیا خوب نظارہ ہو گا
سامنے محبوب ہمارا ہو گا
وہ کیا مدہوشی کا عالم ہو گا
ھو کا عالم ہی جو چھایا ہو گا

یہاں پر ایک لفظ استعمال ہوا ہے جو عموماً شاعر لوگ استعمال کرتے ہیں تو بے ادبی کے زمرے میں آتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ھو کا عالم چھایا ہوا ہے، یہ بے ادبی ہے، کیونکہ ھو سے مراد اللہ پاک کی ذات ہے اس لئے اس کو اس انداز میں بیان نہیں کرنا چاہیے جیسے لوگ بیان کرتے ہیں۔ یہ بے ادبی ہے لیکن وہاں ادب ہو گا کیونکہ وہاں بس اللہ ہی اللہ ہو گا، دوسری طرف نگاہ ہی نہیں جائے گی۔

اُف کیا خوب نظارہ ہو گا
سامنے محبوب ہمارا ہو گا
وقت گزرنے کا تو احساس ختم
چہرہ اپنا جو دکھایا ہو گا

بزرگ فرماتے ہیں کہ اللہ پاک پہلے نعمتوں کی بارش فرما دیں گے کہ جو مانگتے ہو مانگو۔ وہ مسلسل دیتے رہیں گے حتیٰ کہ ہر شخص سوچے گا کہ اب اور کیا مانگوں۔ علاوہ ازیں جنت میں تو ایسی چیزیں ہوں گی جو نہ کسی آنکھ نے دیکھی ہوں گی نہ کسی کان نے سنی ہوں گی۔ اس لئے لوگ حیران ہو جائیں گے کہ اب مزید کیا مانگیں، جب کچھ سمجھ نہیں آئے گا تو اپنے علماء سے پوچھیں گے کہ ہم کیا مانگیں تو وہ بتائیں گے کہ ابھی تک دیدار نہیں ہوا اس لئے وہ مانگنا چاہیے۔ جب لوگ مانگیں گے تو اللہ تعالیٰ اس کا نظام بنا دیں گے۔ دیدار کے دوران وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلے گا، جب ہوش میں آئیں گے تو بہت وقت گزر چکا ہو گا۔ اس کے بعد وہ کہیں گے کہ اصل چیز تو یہی تھی، اس سے پہلے تو ہمیں کچھ بھی نہیں ملا۔

اُف کیا خوب نظارہ ہو گا
سامنے محبوب ہمارا ہو گا
سمجھیں ہم کیا پھر اس عالم کو شبیرؔ
سب کیسے ہوں گے اور کیا ہو گا

یہ وہی بلاکیف و بلا جہت والی بات ہے کہ اب اس کے بارے میں ہم کیا جانیں کہ وہ سب کیسے ہو گا؟ یہ اللہ پاک ہی بہتر جانتا ہے۔

متن:

عقیدہ 12:

انبیاء **علیہم الصلوات والتسلیمات** کی بعثت عالم (تمام جہاں) کے لئے سراسر رحمت ہے۔ اگر ان بزرگواروں کے وجود کا وسیلہ نہ ہوتا تو ہم جیسے گمراہوں کی ذات و صفات واجب الوجود تعالیٰ و تقدس کی معرفت کی طرف کون ھدایت فرماتا اور ہمارے مولا جل شانہٗ کی مرضیات و نا مرضیات والی چیزوں میں کون تمیز کراتا، اور ہماری ناقص عقلیں ان (بزرگواروں) کے نورِ دعوت کی تائید کے بغیر اس کے سمجھنے سے معزول و بے کار ہیں اور ہمارے اَفہامِ نا تمام ان بزرگواروں کی تقلید کے بغیر اس معاملہ میں عاجز و بے بس ہیں۔ بے شک عقل اگرچہ ایک حجت (دلیل) ہے لیکن یہ ایک نا تمام حجت

ہے جو مرتبۂ بلوغ تک نہیں پہنچی ہے "حجتِ بالغہ" (دلیل کامل) انبیاء علیہم الصلوات و التسلیمات کی بعثت ہے جس سے آخرت کا دائمی عذاب و ثواب وابستہ ہے۔

تشریح:

عقل واقعی محدود ہے، کیونکہ عقل ان معلومات پر انحصار کرتی ہے جو اس کے پاس ہیں۔ جس چیز کی آپ کے پاس کوئی معلومات ہی نہیں عقل اس کے بارے میں کچھ نہیں کر سکتی۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کے بارے میں فلاسفہ نے الٰہیات کے ابواب میں عجیب و غریب گل کھلائے ہیں کہ اللہ نے عقلِ اول اور آسمانِ اول بنائے، اس کے بعد عقلِ ثانی بنائی پھر آخر میں عقلِ فعال ہے جو سارے کام کرتی ہے، (**نَعُوذُ بِاللهِ مِنْ ذَالِكَ**) اللہ پاک نے بس عقلِ اول بنا دی، اس کے بعد اللہ پاک کچھ بھی نہیں کرتا۔ یہ انتہائی فضول سوچ ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے کچھ مفروضات قائم کئے ہوتے ہیں انہی کی بنیاد پر وہ یہ فیصلے کرتے ہیں۔ جب یہ مفروضے پورے نہیں ہوتے تو وہ پھنس جاتے ہیں، یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آ سکتی۔ عقل اگرچہ کمپیوٹر کی طرح ایک زبردست چیز ہے لیکن کمپیوٹر کو اگر آپ صحیح اعداد و شمار نہ دیں تو وہ آپ کے لئے بے کار ہے کیونکہ کمپیوٹر بذاتِ خود کچھ نہیں جانتا اسی طرح عقل بھی بذات خود کچھ نہیں جانتی، اس سے کام لینے کے لئے اس کو معلومات دینا پڑیں گی۔ معلومات دو قسم کی ہوتی ہیں: ایک وہ جو دنیا میں بذریعہ مشاہدات و تجربات موجود ہیں وہ معلومات عقل کے پاس جاتی ہیں تو عقل ان کا تجزیہ کر کے کوئی نتیجہ بتاتی ہے۔ مثلاً اگر آپ کوئی زبان سیکھنا چاہیں اور آپ کے پاس اس زبان کے تین لفظ ہوں تو ان کے ذریعے آپ چار پانچ مزید سیکھ لیں گے، اگر آپ کے پاس آٹھ، دس الفاظ ہوں تو ان کے ذریعے آپ پندرہ، بیس الفاظ مزید سیکھ لیں گے۔ اس طرح رفتہ رفتہ آپ پوری زبان سیکھ لیں گے۔ گویا کہ آپ کے پاس جو معلومات ہیں ان کے ذریعے آپ عقل کا استعمال کر کے اس کو مزید ترقی دیں گے، یہ ایک سائنس ہے جو چلتی رہے گی، بنیاد سے آغاز کرتے ہی نظام بناتے ہیں، ارتقاء کا نظام اس سے چل رہا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس اگر آپ کو کسی چیز کی مکمل معلومات مل جائیں اور کہا جائے کہ اس کے مطابق اس کو سمجھو اور اس کے مطابق کام کرو تو اس کے سمجھنے اور کام کرنے میں جو عقل استعمال ہوتی

ہے اس کا شعبہ الگ ہے، اس شعبہ کو ایمانیات کہتے ہیں، عقلیات نہیں کہتے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایمان کی خبریں عقل کو ملی ہیں جن کی بنیاد پر وہ سوچ رہی ہے۔ یہ ایک الگ چیز ہے، پہلے والی کو سائنس کہتے ہیں اور دوسری کو فقاہت کہتے ہیں۔ سائنس بھی ضروری اور اچھی چیز ہے لیکن وہ فقاہت نہیں ہے، فقاہت کا تعلق ایمانیات یعنی ایمانی خبروں کے ساتھ ہے۔ اگر آپ کے پاس ایمانی خبریں آئی ہیں، ان ایمانی خبروں کا جائزہ لینا اور اس کے بعد صحیح بات پہ عمل کرنا فقاہت ہے۔ امام ابو حنیفہ ، امام شافعی ، امام مالک اور امام احمد بن حنبل وغیرہ سب حضرات یہی کرتے تھے۔ اب بھی علمائے کرام یہی کرتے ہیں۔ موجودہ فتاویٰ میں غور کر کے مطلوبہ فتویٰ نکالا جاتا ہے۔ اگر کوئی نئی صورتِ حال آئی ہے تو اس کی کوئی نظیر ڈھونڈیں گے اور گزشتہ کے ساتھ اس کو وابستہ کریں گے کیونکہ دین اوپر سے آیا ہوا ہے اس لئے آپ اس سے کوئی بھی فتویٰ معلوم کر سکیں گے اور یہ فقاہت کا سلسلہ قیامت تک چلتا رہے گا، اسی طرح سائنس کا سلسلہ بھی قیامت تک چلتا رہے گا۔ یہ دونوں چیزیں ضروری ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ و سلم نے فرمایا:

"**أَنْتُمْ أَعْلَمُ بِأُمُورِ دُنْيَاكُمْ**" (صحیح مسلم: 2363)

ترجمہ: "تم اپنے دنیاوی امور کو بہتر جانتے ہو"۔

اس میں سائنس کی اجازت دی گئی ہے اور فقاہت کے لئے آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرمانا چاہتے ہیں اس کو" **تَفَقُّهٌ فِي الدِّيْنِ**" نصیب فرماتے ہیں۔

متن:

سوال:

جب آخرت کا دائمی عذاب بعثت پر موقوف ہے تو پھر بعثت کو "رحمتِ عالمیان" کہنا کیا معنی ہو گا؟

تشریح:

یعنی اگر بالفرض بعثت نہ ہوتی تو آخرت کا دائمی عذاب بھی نہ ہوتا، اس سے معلوم

ہوا کہ عذاب کا سبب بعثت ہے تو پھر بعثت کو عالمین کے لئے رحمت کہنے کا کیا معنی ہو گا؟

متن:

جواب:

بعثتِ (انبیاء علیہم الصلوات و التسلیمات) عین رحمت ہے کیونکہ یہ واجب الوجود تعالیٰ و تقدس کی ذات و صفات کی معرفت کا سبب ہے جس میں دنیا و آخرت کی سعادتیں شامل ہیں۔ اور بعثت (انبیاء علیہم الصلوات و التسلیمات) کی دولت کی وجہ سے معلوم ہو گیا کہ فلاں چیز حق تعالیٰ کی بارگاہ قدس کے مناسب ہے اور فلاں نا مناسب۔ کیونکہ ہماری لنگڑی اور اندھی عقل امکان و حدوث کے داغ سے داغ دار ہے، وہ کیا سمجھے کہ اس حضرت وجوب کے لئے جس کے واسطے قدم لازم ہے اس کے اسماء و صفات اور افعال میں سے کون سے مناسب ہیں اور کون سے نامناسب تاکہ ان مناسب (اسماء و صفات) کا اطلاق کیا جائے اور نا مناسب سے پرہیز کیا جائے۔ بلکہ بعض اوقات (ہماری اندھی عقل) اپنے نقص کی وجہ سے کمال کو نقص جانتی ہے اور نقص کو کمال سمجھنے لگتی ہے۔

فقیر کے نزدیک یہ (مناسب و نامناسب کا) امتیاز تمام ظاہری اور باطنی نعمتوں سے بڑھ کر ہے۔ وہ شخص بڑا ہی بد بخت ہے جو نا مناسب امور کو اس تعالیٰ کی پاک بارگاہ کی طرف منسوب کر دے اور نا شائستہ چیزوں کو حضرت حق سبحانہ و تعالیٰ کے ساتھ نسبت دے۔ یہ بعثت (**انبیاءعلیہم الصلوات والتسلیمات**) ہی کا کار نامہ ہے جس نے حق کو باطل سے جدا کر دیا۔ بعثت ہی کی وجہ سے غیر مستحق عبادت اور مستحق عبادت (حق جل و علا) کے درمیان تمیز قائم کی۔ یہ بعثت ہی ہے کہ جس کے ذریعے حق جل و علا کے راستے کی طرف دعوت دی جاتی ہے جو بندوں کو مولی جل سلطانہٗ کے قرب اور وصل کی سعادت تک پہنچاتی ہے اور بعثت ہی کے وسیلے سے مولیٰ جل شانہ کی مرضیات کی اطلاع میسر ہوتی ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا۔

تشریح:

ابھی ابھی اس سیاق و سباق میں ایک بات دل آئی ہے وہ عرض کرتا ہوں۔ جانوروں کے ساتھ یہ مسئلہ نہیں ہے، جانوروں کے لئے پیغمبر نہیں آتے اس لئے ان کو عذاب

نہیں دیا جائے گا اور نہ ان کو ثواب دیا جائے گا۔ دنیا میں جو ہوا بس وہی ہو گیا۔ اس لئے اگر بعثت سے کوئی اپنے آپ کو کاٹنا چاہتا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ جانور بننا چاہتا ہے کیونکہ یہ معاملہ تو جانوروں کے ساتھ ہو رہا ہے۔ ان کے اوپر بعثت کا اثر نہیں ہے جس کی وجہ سے وہ اپنی اپنی جبلت کے مطابق زندگی گزار رہے ہیں، ان کے لئے نہ گناہ ہے نہ ثواب ہے، بس جس وقت ان کی زندگی ختم ہو گئی، اس کے ساتھ سب کچھ ختم ہو گیا اور مزید کچھ نہیں رہا۔ انسان کے لئے یہ معاملہ نہیں ہے، اس کے لئے انسانیت ہے، انسانیت سمجھانے کے لئے ہی پیغمبر تشریف لائے کہ کون سی چیز صحیح ہے اور کون سی غلط ہے، کون سا عمل کرنا ہے اور کون سا نہیں کرنا، اللہ کے ساتھ تعلق کیسا ہونا چاہیے، اللہ کی صفات اور باقی تمام چیزوں کے بارے میں جاننے کے لئے ہم بعثت کے محتاج ہیں اور اس کے ذریعے سے ہمیں اللہ تعالیٰ کی وسیع رحمت حاصل ہوتی ہے۔

متن:

بعثت ہی کے طفیل اس تعالیٰ کی ملک میں تصرف کے جواز و عدم جواز کی تمیز حاصل ہوتی ہے۔ بعثت کے فوائد کی مثالیں بکثرت ہیں۔ پس ثابت ہوا کہ انبیاء کی بعثت سراپا رحمت ہے۔ جو شخص اس نفس امارہ کا مطیع ہو گیا اور شیطان لعین کے حکم سے بعثت کا انکار کرتا ہے اور بعثت کے تقاضوں کے مطابق عمل نہیں کرتا تو اس میں بعثت کا کیا گناہ اور بعثت کس طرح رحمت نہ ہو گی۔

سوال:

ہر چند عقل اپنی ذات کی حد تک احکام الہیٰ جل شانہ کی بجا آوری میں ناقص و نا تمام ہے لیکن ایسا کیوں نہیں ہو سکتا کہ تصفیہ اور تزکیہ حاصل ہونے کے بعد عقل کو مرتبۂ وجوب تعالیٰ و تقدس کے ساتھ ایک بے تکیّف مناسبت اور اتصال پیدا ہو جائے کہ جس مناسبت اور اتصال کے سبب وہ احکام کو وہاں سے اخذ کر لے اور اس کو اس بعثت کی جو فرشتے کے واسطے سے ہے، کوئی حاجت نہ رہے۔

تشریح:

چونکہ اس زمانے میں اس قسم کی باتیں ہو رہی تھیں اس لئے حضرت نے ان کے رد میں یہ باتیں لکھیں۔ اکبر کے نام نہاد دینِ الٰہی میں اس نے اس قسم کے سوالات

پیدا کئے تھے۔ حضرت کے سامنے یہ باتیں پہنچیں تو حضرت نے ان چیزوں کے جوابات دیئے۔ یہ چیزیں ہمارے لئے نہیں ہیں کیونکہ آج کل شاید ان چیزوں پہ کوئی بات نہیں کر رہا، البتہ ان کے علاوہ کچھ اور چیزیں آ گئی ہیں جو ہمارے ساتھ ہو رہی ہیں۔

متن:

جواب:

اگرچہ عقل یہ مناسبت اور اتصال پیدا کر لے لیکن وہ تعلق جو اس کا جسمانی بدن کے ساتھ ہے وہ بالکل ختم نہیں ہوتا اور کامل طور پر علیحدگی حاصل نہیں ہوتی، لہذا قوتِ واہمہ ہمیشہ دامن گیر رہتی ہے، اور قوت متخیلہ ہر گز اس کا خیال نہیں چھوڑتی اور قوت غضبیہ اور شہویہ ہمیشہ اس کے ساتھ رہتی ہے اور حرص و لالچ کے رذائل ہر وقت اس کے ہم نشین رہتے ہیں۔ سہو و نسیان جو نوع انسانی کے لوازمات میں سے ہیں اس کی عقل سے مکمل طور پر جدا نہیں ہوتے، اور غلطی و خطا جو اس جہان کا خاصہ ہے اس سے جدا نہیں ہوتے۔ لہذا عقل اعتماد کے لائق نہیں ہے، اور اس سے ماخوذ احکام وہم اور تصرف خیال کے غلبہ سے محفوظ نہیں رہتے اور نسیان و خطا کے گمان کی آمیزش سے محفوظ نہیں رہتے، بر خلاف فرشتے کے کہ وہ ان اوصاف سے پاک اور ان رذائل سے مبرا ہے تو لازمًا وہ اعتماد کے قابل ہے۔

تشریح:

یہاں پر اگر عقل اور کشف پر ساتھ ساتھ بحث کر لی جائے تو بات زیادہ آسانی سے سمجھ میں آ جائے گی۔ کشف میں یہ خطرہ ہوتا ہے کہ کہیں شیطان اس میں اپنی بات نہ ملا دے۔ اس وجہ سے ہمیں بھی اس بارے میں رہنمائی در کار ہوتی ہے کہ ہمارا کشف صحیح ہے یا غلط ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ انسان عقل میں نفس کی آمیزش سے نہیں بچ سکتا کیونکہ عقل کو جو خبر مل رہی ہے اس خبر میں بھی نفس کا واسطہ ہے۔ مثال کے طور پر عقل کو درد کا احساس ہوتا ہے تو اس کے مطابق عقل کچھ فیصلہ بھی کرے گی۔ درد، خواہش، شہوت؛ یہ تمام چیزیں انسان کے ساتھ ہیں، میں کتنے ہی عقل کے گھوڑے دوڑا لوں لیکن کسی بات کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ محض عقل کی بنیاد پر نہیں

کر سکتا کیونکہ اس میں نفس کی آمیزش ہوتی ہے۔ آج کل یورپ کا مشاہدہ کر لیں تو یہ بات واضح طور پر سمجھ میں آ جائے گی۔ کیا یورپ میں رہنے والے عقلاء کو معاشرے میں ہونے والی یہ برائیاں نظر نہیں آ رہیں؟ ان لوگوں نے قوانین ایسے بنائے ہیں جن میں برائی ہی پھیل سکتی ہے۔ وہاں کی پارلیمنٹ میں جو عقلا بیٹھے ہیں اور جو ان کے مفکر حضرات ہیں، کیا انہیں ان قوانین کی برائیوں کا پتا نہیں ہے؟ ان کو سب پتا ہے لیکن شیطانی نظام ان کے اوپر طاری ہے جو ان کو سوچنے ہی نہیں دیتا۔ چونکہ میں جرمنی میں رہا ہوں تو مجھے ان چیزوں سے واسطہ پڑا ہے۔ وہاں یہ حالت ہے کہ آپ اپنے بچے کو کچھ نہیں کہہ سکتے، اگر کچھ کہیں گے تو آپ کے خلاف مقدمہ بن جائے گا۔ اس حال میں آپ بچے کی تربیت کیسے کریں گے؟ وہ پولیس کو ایک فون کرے گا تو پولیس پہنچ جائے گی اور بچے کو آپ سے لے جائے گی۔ خدا نخواستہ اگر کسی کی بیوی بد چلن ہو جائے تو آپ اس کو کچھ نہیں کہہ سکتے کیونکہ اس کی اپنی مرضی ہے، وہ جو بھی کرے، آپ اس کی مرضی کے خلاف اس کو مجبور نہیں کر سکتے۔ یہ مذہبی رشتے ان کے ہاں اہمیت نہیں رکھتے لیکن اپنی قوت ارادی اور اظہار رائے کی آزادی کی ان کے ہاں بہت اہمیت ہے۔ انہوں نے قوانین ایسے شیطانی انداز سے بنائے ہوئے ہیں کہ ان میں شریف آدمی ہی جکڑا جاتا ہے۔ جو صحیح کام کر رہا ہے اس کے لئے راستہ نہیں ملتا اور بروں کے لئے اس میں راستہ بنتا جاتا ہے۔ الغرض سارا نظام ہی برائی کا ہے اور یہ سارا نظام وہاں کے عقلا نے بنایا ہوا ہے۔ معلوم ہوا کہ اگر اللہ کی طرف سے ہدایت کا نظام نہ ہو تو عقل ایسے ہی ٹھوکریں کھائے گی۔ ایسے لوگ اپنی غلطی نہیں سمجھ سکتے، اس کو سمجھنے کے لئے جتنا زمانہ چاہیے وہ اس سے پہلے ہی گزر چکے ہوں گے۔ جب کہ ہمیں الحمد للہ پورے کا پورا نظام ملا ہوا ہے، ہم صرف اس کے سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کے مکلف ہیں۔

متن:

اور اس سے ماخوذ احکام وہم و خیال کی آمیزش اور نسیان و خطا کے گمان سے محفوظ ہیں اور بعض اوقات وہ علوم جو تلقی روحانی (القائے روحانی) سے اخذ کئے ہوئے ہوتے ہیں ان کے متعلق تبلیغ کے دوران ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قویٰ و حواس کے

ساتھ بعض مقدمات مسلمہ غیر صادقہ جو وہم و خیال یا کسی اور ذریعہ سے حاصل ہوئے ہیں، بے اختیار ان علوم کے ساتھ اس طرح خلط ملط ہو جاتے ہیں کہ اس وقت ہر گز تمیز ممکن نہیں رہتی، اور دوسرے وقت میں ایسا ہوتا ہے کہ اس تمیز کا علم دے دیا جاتا ہے اور کبھی نہیں دیا جاتا۔ لہذا لازمی طور پر وہ علوم ان مقدمات کے مل جانے کی وجہ سے کذب کی ہیئت پیدا کر لیتے ہیں اور اعتماد کے قابل نہیں رہتے۔ یا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تصفیہ اور تزکیہ کا حاصل ہونا "اعمال صالح" کے بجالانے پر موقوف ہے جو "مرضیات مولیٰ سبحانہٗ" ہیں اور یہ معنی بعثت (انبیاء) سے وابستہ ہیں جیسا کہ بیان ہو چکا۔

تشریح:

تزکیہ کا مطلب یہ ہے کہ آپ نفس کی نہ مانیں بلکہ اللہ کی مانیں۔ ہر وقت آپ کے پاس نفس بھی ہے اور اللہ کا حکم بھی ہے۔ آپ اللہ کا حکم مانیں گے اور نفس کی نہیں مانیں گے تو یہ تزکیہ ہے۔

﴿فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا﴾ (الشمس: 8)

ترجمہ: "پھر اس کے نفس میں وہ بات بھی ڈال دی جو اس کے لیے بدکاری کی ہے، اور وہ بھی جو اس کے لیے پرہیزگاری کی ہے"۔

فجور کی بات تو نفس میں آ گئی، اب تقویٰ کے بارے میں کون بتائے گا کہ کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔ اس کا تعلق تو اوامر و نواہی کے ساتھ ہے۔ اوامر و نواہی کوئی نہیں بتائے گا تو آپ کو کیسے پتا چلے گا؟ چنانچہ پھر آپ فجور میں ہی رہ جائیں گے لہٰذا آپ کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ہے کہ شریعت سے رہنمائی حاصل کریں۔

متن:

لہذا ثابت ہوا کہ بعثت کے بغیر تصفیہ اور تزکیہ کی حقیقت میسر نہیں ہوتی اور وہ صفائی جو کفار اور اہل فسق کو حاصل ہوتی ہے وہ نفس کی صفائی ہے نہ کہ قلب کی صفائی، اور نفس کی صفائی سوائے گمراہی کے کچھ نہیں بڑھاتی، اور سوائے نقصان کے اور کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ بعض غیبی امور کا کشف جو صفائی نفس کے وقت کفار اور اہل فسق کو حاصل ہو جاتا ہے وہ استدراج ہے جس سے مقصود اس جماعت کی خرابی اور نقصان ہے۔

تشریح:

نفس کی صفائی کیا چیز ہے؟ میرے خیال میں یہ بہت مشکل سوال ہے لیکن اللہ پاک نے دماغ میں اس کا جواب ڈال دیا ہے، الحمد للہ۔ نفس کی صفائی سے مراد یکسوئی ہے، نفس کی باہمی خواہشات آپس میں مخالف ہوں تو یہ پراگندگی ہے اور اس کا مطلب ہے کہ آپ یکسو نہیں ہو سکتے۔ آپ نفس کو ایک رخ پر لے آئیں تو اس سے نفس کی قوت و صلاحیت بڑھ جاتی ہے جو مختلف قسم کے شعبدہ باز انسانوں کے لئے رستے کھولتی ہے۔ اس کی وجہ سے انسان بہت سے ایسے کام کر سکتا ہے جو عام انسان نہیں کر سکتے۔ جوگ وغیرہ میں یہی ہوتا ہے، جیسے ابھی جوگی کا واقعہ گزرا۔ اس نے بھی صرف یکسوئی حاصل کی تھی جس کی وجہ سے اس کے ہاتھ پہ ایسے کام ہوتے تھے جن کو لوگ بظاہر کرامات سمجھتے ہیں۔ حاصل یہ کہ نفس کی صفائی در اصل انسان کی صلاحیت کو ایک رخ پر لے آتی ہے۔ جیسے سورج کی روشنی ہر چیز پہ پڑتی ہے اور اس سے ہر چیز اپنی استعداد کے مطابق گرم ہوتی ہے لیکن اگر آپ اس کے سامنے عدسہ لگا دیں تو اس کی وجہ سے وہ ساری گرمی کسی ایک نقطے پر جمع ہو جاتی ہے نتیجتاً وہ اس جگہ کو جلا دیتی ہے حالانکہ عام روشنی اس کو نہیں جلا سکتی صرف گرم کر سکتی ہے۔ اگر کوئی شخص اس طرح اپنے نفس کو قابو کر لے تو اس سے کچھ ایسے محیر العقول کام سرزد ہوں گے جن کو دیکھ کر لوگ اس کی بہت زیادہ واہ واہ کریں گے۔ نفس کی صفائی سے یہ چیزیں حاصل ہو سکتی ہیں۔

متن:

اس تحقیق سے واضح ہو گیا کہ تکلیفِ شرعی جو بعثت (انبیاء) کی راہ سے ثابت ہوئی ہے وہ بھی رحمت ہی ہے، نہ کہ جس طرح تکلیف شرعی کے منکروں یعنی ملحدوں اور زندیقوں نے گمان کیا ہے اور تکلیف شرعی کو مصیبت جان کر غیر معقول اور نا پسند قرار دیا ہے اور کہتے ہیں کہ یہ کون سی مہربانی ہے کہ بندوں کو امور شاقہ کی تکلیف دی جائے پھر ان سے کہا جائے کہ اگر تم اس تکلیف کے مطابق عمل کرو گے تو بہشت میں جاؤ گے اور اگر اس کے خلاف کرو گے تو دوزخ میں جاؤ گے، ان کو ایسے امور کی کیوں تکلیف دیتے ہیں اور ان کو کیوں نہیں چھوڑ دیتے کہ کھائیں، پئیں اور سوئیں، اور جس طرح چاہیں اپنے طور پر زندگی بسر کریں۔ (یہ منکرین) بد نصیب اور بے عقل یہ

نہیں جانتے کہ از روئے عقل "**شکرِ منعم**" ادا کرنا واجب ہے۔

تشریح:

یہ ظالم باقی تمام چیزوں میں یہ بات جانتے ہیں، چنانچہ اگر کوئی آدمی کسی کے اوپر احسان کر دے تو شرفاء شکر ادا کرتے ہیں اور اس کے ممنون ہوتے ہیں لیکن یہ لوگ اللہ جل شانہ کے ممنون ہونے کو غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ اسی طرح قادیانی جب لوگوں کے ساتھ تھوڑی سی دنیاوی مدارات کرتے ہیں تو لوگ ان کے بہت زیادہ ممنون ہوتے ہیں، حتی کہ بعض بد نصیب اپنا دین تک چھوڑ دیتے ہیں۔

ریاض میں ہمارے ایک استاد دوست تھے جو کچھ زیادہ ہی مغرب پرست تھے۔ ایک بار ان کو امریکہ میں پی ایچ ڈی کے لئے 550 ڈالر کی سکالر شپ ملی تو وہ بار بار اس خط کو چومتے تھے اور امریکہ زندہ باد کا نعرہ لگاتے تھے۔ میں ان کو کہتا کہ خدا کے بندے! امریکہ یہ 550 ڈالر تمہیں مفت میں تو نہیں دے رہا، اس کے بدلے تم سے کتنا کام لے رہا ہے جب کہ اللہ پاک نے تمہیں جو کچھ دیا ہے، اس کے بدلے وہ تم سے کچھ بھی نہیں لے رہا۔ لیکن یہ باتیں ان کو سمجھ نہیں آئیں۔

متن:

اور یہ تکلیفاتِ شرعیہ اس شکر کے بجالانے کا بیان ہے لہذا تکلیف (شرعی) عقل کی رو سے بھی واجب ہے۔ اسی طرح "نظام عالم" "تکلیفاتِ شرعیہ" کے ساتھ وابستہ ہے۔

تشریح:

دنیاوی لحاظ سے مختلف چیزوں کو قابو میں رکھنے کا کوئی نظام نہ ہو تو لوگوں کو اطمینان نہیں مل سکتا۔ مثلاً ٹریفک ہی کو لے لیں، ٹریفک کے قوانین کے ذریعے آپ کو روک دیا جاتا ہے، آپ کا بھلے کتنا ہی ضروری کام ہو، سرخ بتی پر آپ کو لازماً رکنا پڑے گا، اگر آپ نہیں رکیں گے تو جرمانہ دینا پڑے گا۔ اگر آپ ٹریفک والے سے کہیں کہ مجھے ضرورت ہے، مجھے جانے دیں تو وہ کہے گا کہ صرف تمہیں ضرورت نہیں ہے اور بھی لوگوں کی ضرورت ہے، ہمیں سب کی رعایت کرنی ہے، اگر ہم یہ نہیں کریں گے تو سب لوگ نقصان اٹھائیں گے۔ بعض دفعہ جب کسی جگہ پر بھیڑ ہو جاتی ہے اور بجلی

گئی ہوتی ہے اور اشارے کام نہیں کر رہے ہوتے، ٹریفک پولیس کے لوگ بھی غائب ہوتے ہیں تو لوگ خود کہتے ہیں کہ پولیس والے کدھر گئے، وہ ہوتے تو یہ معاملہ ٹھیک کرتے۔ اسی طرح دنیا کا سارا نظام قوانین پر چل رہا ہے اور قوانین پر عمل کرنے میں تکلیف تو برداشت کرنی پڑتی ہے۔ آپ کو ہر چیز کے اصولوں پر عمل کرنا ہے۔ نہیں کریں گے تو یہ جرم ہے۔ آج کل کرونا سے بچاؤ کے اصولوں پر ہر طرف گفتگو ہو رہی ہے یہ اصول بھی قوانین ہی ہیں۔ یقیناً آپ کو ان قوانین پہ عمل کرنے میں تکلیف ہو گی لیکن اجتماعی معاملات کے اندر یہ سب برداشت کرنا پڑتا ہے۔ حاصل یہ کہ آپ کے فائدے کے لئے قوانین بنائے گئے ہیں، اور کچھ تکالیف بھی دی گئی ہیں کہ یہ کرنا ہے اور یہ نہیں کرنا، ان سب کا فائدہ آپ کو آخرت میں ہو گا۔

متن:

اگر ہر ایک کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جاتا تو سوائے شرارت و فساد کے کچھ ظہور میں نہ آتا، اور ہر بو الہوس (لالچ رکھنے والا) دوسرے کی جان و مال میں دست درازی کرتا اور خباثت و شرارت سے پیش آتا، اس طرح خود بھی ضائع ہوتا اور دوسروں کو ضائع کرتا۔ **عِیَاذًا بِاللّٰہِ سُبْحَانَہٗ**۔ اگر سختی اور شرعی موانع حائل نہ ہوتے تو معلوم نہیں کہ کس قدر شرارت و فساد ظاہر ہوتا۔ ﴿**وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ**﴾ (بقرہ: 179) "اے عقلمندو! تمہارے لئے قصاص میں ہی زندگی ہے"۔

یا ہم یہ کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ زمین و آسمان اور ہر چیز کا خود مختار مالک ہے اور (تمام) بندے اس سبحانہٗ کے مملوک اور غلام ہیں۔ لہذا جو حکم و تصرف وہ ان میں فرماتا ہے وہ عین خیر و اصلاح ہے اور ظلم و فساد کی آمیزش سے منزہ و مبرا ہے۔ ﴿**لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ**﴾ (انبیاء: 23) "وہ جو کچھ کرتا ہے اس سے کوئی نہیں پوچھ سکتا"۔

اگر وہ سب کو دوزخ میں ڈال دے اور دائمی عذاب کا حکم فرمائے تو کسی کو اعتراض کی کیا مجال ہے اور یہ غیر کی ملک میں تصرف نہیں ہے کہ اس میں ظلم و ستم کا شائبہ ہو۔ بر خلاف ہماری املاک کے جو فی الحقیقت اسی سبحانہ کی املاک ہیں، ان املاک میں تمام تصرفات (سوائے ان کے جو جائز ہیں) عین ستم ہیں۔ کیونکہ صاحب شرع نے بعض مصالح کی بنا پر ان املاک کی نسبت ہماری طرف کر دی ہے لیکن حقیقت میں

وہ سب اسی سبحانہٗ کی ملکیت ہیں۔ لہذا ان میں ہمارا تصرف اسی قدر جائز ہے جس قدر مالک علی الاطلاق (بالکلیہ مالک) حق تعالیٰ نے ان میں تصرف کی اجازت دی اور مباح فرمایا۔ کیونکہ ان بزرگواروں (یعنی انبیاء علیہم الصلوات و التسلیمات) نے حق جل و علا کے احکام کے بارے میں خبریں دی ہیں اور جو احکام بیان فرمائے ہیں وہ سب سچے اور واقعہ کے مطابق ہیں۔ (علما نے) احکام اجتہادیہ میں ان بزرگوار (پیغمبران علیہم الصلوات و التسلیمات و التحیات) سے اگرچہ خطا کو تجویز کیا ہے لیکن خطا کے برقرار رکھنے کو ان کے حق میں جائز نہیں رکھا اور فرمایا ہے کہ ان کو ان کی خطا پر جلدی متنبہ کر دیتے ہیں اور ان کی خطا کا تدارک صواب سے کر دیتے ہیں "فَلَا اِعْتِدَادَ بِذٰلِكَ الْخَطَإِ" (لہذا یہ خطا کسی گنتی میں نہیں ہے)۔

تشریح:

یہ در اصل تربیت کا ایک نظام ہے، اللہ جل شانہ کی طرف سے انبیائے کرام کی تربیت کے لئے وحی بھی آتی ہے اور ساتھ ساتھ کچھ عملی چیزیں بھی ہوتی ہیں۔ زندگی میں جو واقعات آتے ہیں ان سے بھی تربیت ہوتی ہے۔ اس تربیت کا طریقہ کار یہ ہوتا ہے کہ اجتہادی طور پر پیغمبر نے ایک کام کیا، اس کے بعد حکم آگیا کہ یہ نہیں کرنا بلکہ دوسرا کام کرنا ہے، تو حکم تبدیل ہو گیا۔ اس صورت میں پہلا کام سیکھنے کے لئے کروایا گیا تھا جب سیکھ لیا تو اس کی بنیاد پر دوسرا حکم دیا گیا۔ جیسے

﴿عَبَسَ وَتَوَلّٰى ۝ أَنْ جَاءَهُ الْأَعْمٰى﴾ (عبس: 1-2)

ترجمہ: "(پیغمبر نے) منہ بنایا، اور رخ پھیر لیا۔ اس لیے کہ ان کے پاس وہ نابینا آگیا تھا"۔

اس آیت کا شان نزول یہ ہے کہ آپ ﷺ بڑے بڑے مشرکوں کو جمع کر کے تبلیغ فرما رہے تھے کہ حضرت عبد اللہ بن ام مکتوم تشریف لائے، وہ نابینا تھے انہیں معلوم نہیں ہوا کہ آپ ﷺ گفتگو فرما رہے ہیں۔ انہوں نے آکر نبی ﷺ کو مخاطب کر کے بات کرنا شروع کر دی۔ نبی ﷺ کو ان کی یہ بات ناگوار گزری۔ آپ ﷺ کا خیال یہ تھا کہ عبد اللہ بن ام مکتوم تو اپنے آدمی ہیں، وہ بعد میں بھی آ سکتے ہیں جبکہ عبد اللہ بن ام مکتوم کا عذر یہ تھا کہ انہیں نظر ہی نہیں آ رہا تھا

کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔ لہٰذا آپ ﷺ کی طبیعت پر بوجھ آیا اور اس بوجھ کے بارے میں اللہ جل شانہ نے ارشاد فرمایا کہ یہ ٹھیک نہیں ہے، طالب کا حق پہلے ہے، یہ آپ کو بوجھ نہیں لگنا چاہیے۔ اب یہ واقعہ اللہ تعالیٰ کی منشا سے ہی صادر ہوا اور اس کا مقصد نبی ﷺ کے ذریعہ امت کو یہ بات سکھانا تھا کہ طالب کا حق پہلے نمبر پر ہوتا ہے، اس لئے طالب کو ترجیح دینی چاہیے۔ یہ واقعہ تھا تو اجتہادی غلطی لیکن اس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک مکمل مسئلے کا علم نصیب فرما دیا۔ اس لئے ہم پیغمبروں کی اجتہادی خطا کو غلطی نہیں کہیں گے، بلکہ اسے تربیت کا نظام کہیں گے۔

متن:

عقیدہ: 13

اور قبر کا عذاب خاص طور پر کافروں کے لئے اور بعض گنہگار اہل ایمان کے لئے "**حق**" ہے کیونکہ مخبر صادق علیہ و علی آلہ الصلوات والتسلیمات نے اس کی خبر دی ہے۔

تشریح:

آج کل بھی کچھ ایسے لوگ ہیں جو قبر کے عذاب کے منکر ہیں حالانکہ اس کے بارے میں متواتر احادیث شریفہ موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ عذابِ قبر حق ہے اور اس کا انکار کرنا بدعت ہے۔

متن:

عقیدہ: 14

اور قبر میں مومنوں اور کافروں سے منکر نکیر کا سوال بھی "حق" ہے۔ کیونکہ دنیا اور آخرت کے درمیان "قبر" ایک برزخ ہے۔ اس کا عذاب بھی ایک وجہ سے دنیاوی عذاب سے مناسبت رکھتا ہے اور انقطاع پذیر (ختم ہونے والا) ہے اور دوسری وجہ سے اس کو عذاب اخروی کے ساتھ مناسبت ہے کیونکہ وہ حقیقت میں آخرت کے عذابوں میں سے ہے۔ آیت کریمہ ﴿اَلنَّارُ یُعْرَضُوْنَ عَلَیْهَا غُدُوًّا وَّ عَشِیًّا﴾ (مومن: 46)

"وہ صبح و شام آگ (دوزخ) پر پیش کئے جاتے ہیں"۔

"**نَزَلَتْ فِی عَذَابِ الْقَبْرِ**" "یہ آیت عذاب قبر کے متعلق نازل ہوئی ہے"۔

اور اسی طرح قبر کی راحت بھی دو حیثیتیں رکھتی ہے، وہ شخص بہت ہی سعادت مند ہے جس کی لغزشوں اور گناہوں کو کمالِ کرم اور مہربانی سے معاف فرما دیں اور ہر گز اس سے مواخذہ نہ کریں اور اگر مقامِ مواخذہ میں آ جائے تو بھی اپنی کمال رحمت سے دنیاوی آلام و مصائب کی تکالیف کو اس کے گناہوں کا کفارہ قرار دے دیں۔ اور اگر کچھ باقی رہ جائے تو قبر کی تنگی اور ان تکلیفوں کو جو اس مقام میں مقرر ہیں ان سے کفارہ کر دیں تاکہ پاک و پاکیزہ ہو کر حشر میں مبعوث ہو۔ اور جس کسی کے لئے ایسا نہ کریں اور اس کا مواخذہ آخرت پر چھوڑ دیں تو یہ بھی عین عدل ہے۔ لیکن گنہگاروں اور شرمساروں کے حال پر افسوس ہے۔ ہاں اگر وہ (گنہگار) اہل اسلام سے ہے تو اس کا انجام رحمت سے ہے اور وہ عذاب ابدی سے محفوظ ہے، یہ بھی ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ "**رَبَّنَا اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْر۔ بِحُرْمَةِ سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ عَلَیْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَعَلَیْهِمُ الصَّلٰوتُ وَالتَّسْلِیْمَاتُ**" "اے ہمارے رب! سید المرسلین علیہ و علیٰ آلہ و علیہم الصلوات و التسلیمات کے طفیل ہمارے نور کو کامل فرما اور ہم کو بخش دے بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے"۔

تشریح:

اس کا مطلب یہ ہے کہ منکر نکیر کا سوال برزخی سوال ہے، یہ درمیان کی بات ہے، اصل حساب آگے ہو گا۔ گویا کہ یہ حوالات کی طرح کوئی چیز ہے، برزخ والی زندگی اس کے حساب سے گزرے گی۔ یہاں تین سوال کئے جائیں گے:

(1)۔ "**مَنْ رَّبُّكَ؟**" "تمہارا رب کون ہے؟"

(2)۔ "**مَا دِیْنُكَ؟**" "تمہارا دین کیا ہے؟"

(3)۔ "**مَا هٰذَا الرَّجُلُ الَّذِیْ بُعِثَ فِیْكُمْ؟**" یہ کون صاحب ہیں جو تمہارے درمیان بھیجے گئے تھے؟"

ان تینوں کے جواب اگرچہ ظاہر ہیں، لیکن یہ علمی سوال نہیں ہیں، بلکہ عملی سوال ہیں، یعنی جیسا عمل کیا ہو گا اسی حساب سے جواب دے سکیں گے۔

متن:

عقیدہ: 15

روز قیامت "**حق**" ہے۔ اس روز آسمان، ستارے، زمین، پہاڑ، سمندر، حیوان، نباتات اور معدنیات سب کے سب معدوم و ناچیز ہو جائیں گے۔ آسمان شق ہو جائیں گے اور ستارے منتشر ہو کر گر جائیں گے، اور زمین و پہاڑ پراگندہ ذرات ہو جائیں گے۔ اس تمام توڑ پھوڑ اور فنا کا تعلق نفخۂ اولیٰ سے ہے۔ نفخۂ ثانیہ (دوسرے صور) پر لوگ قبروں سے اٹھ کر محشر کی طرف روانہ ہوں گے۔ فلاسفہ (یعنی حکمائے یونان وغیرہ) آسمانوں اور ستاروں کے نیست و نابود ہونے کو نہیں مانتے اور ان کا فانی اور فاسد ہونا جائز نہیں سمجھتے۔ وہ ان کو ازلی اور ابدی کہتے ہیں اور اس امر کے باوجود ان میں سے متاخرین اپنی بے وقوفی کی وجہ سے اپنے آپ کو زمرۂ اہلِ اسلام میں شمار کرتے ہیں اور اسلام کے بعض احکام کو بھی بجالانے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ بعض اہلِ اسلام ان کی ان باتوں پر یقین رکھتے ہیں اور جرأت و دلیری کے ساتھ ان کو مسلمان سمجھتے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ بعض مسلمان ان لوگوں میں سے بعض کے اسلام کو کامل جانتے ہیں اور اگر کوئی ان پر طعن و تشنیع کرے تو اس کو بہت برا سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ لوگ نصوص قطعیہ کے منکر ہیں اور انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات کے اجماع کا انکار کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿**إِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ۝ وَإِذَا النُّجُومُ انكَدَرَتْ ۝**﴾ (تکویر: 1، 2) "جب آفتاب بے نور ہو جائے گا اور ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر گر پڑیں گے"۔

نیز اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿**إِذَا السَّمَاءُ انشَقَّتْ ۝ وَأَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ۝**﴾ (انشقاق: 1-2) "جب آسمان پھٹ جائے گا اور اپنے رب کا حکم سن لے گا، اور وہ اسی لائق ہے"۔

وہ یہ نہیں جانتے کہ صرف کلمۂ شہادت زبان سے ادا کر لینا اسلام میں کافی نہیں ہے، بلکہ ان تمام چیزوں کی تصدیق بھی ضروری ہے جن کا بجا لانا اور ان پر عمل کرنا دین کی ضروریات میں سے ہے، اور کفر و کافری سے برأت اختیار کرنا اور بیزار ہونا بھی ضروری ہے تاکہ اسلام متصور ہو جائے۔ "**وَبِدُونِهِ خَرْطُ الْقَتَادِ**" "اور اس کے

علاوہ بے فائدہ تکلیف اٹھانا ہے"۔

عقیدہ: 16

اور حساب، میزان (اعمال کا وزن ہونا) اور پل صراط "حق" ہے کہ مخبر صادق علیہ و علی آلہ السلام نے ان کی خبر دی ہے۔ (لیکن) نبوت کے اطوار سے نا واقفیت کی بنا پر بعض جاہلوں کا ان امور کو بعید از عقل سمجھنا درجہ اعتبار سے ساقط ہے کیونکہ نبوت کے اطوار عقل کے اطوار سے بالاتر ہیں۔ حقیقت میں انبیاء کرام علیہم السلام کی سچی خبروں کو عقل کی نظر کے موافق کرنے کی کوشش کرنا حقیقت میں "طور نبوت" سے انکار ہے کیونکہ یہاں معاملہ صرف تقلید (انبیاء) پر مبنی ہے۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ "طور نبوت" "طور عقل" کے مخالف ہے، بلکہ "طور عقل" انبیاء علیہم الصلوات و التسلیمات کی تقلید کی تائید کے بغیر اس عالی مطلب کی طرف ہدایت حاصل نہیں کر سکتی۔ مخالفت دوسری چیز ہے اور رسائی نہ ہونا دوسری بات ہے کیونکہ مخالفت رسائی کے بعد متصور ہوتی ہے۔

تشریح:

یعنی رسائی ہو جائے تو اس کے بعد مخالفت کا نمبر آئے گا، ہماری تو وہاں تک رسائی ہی نہیں، ہاں ہماری وہاں تک رسائی انبیائے کرام کے ذریعے سے ہو سکتی ہے۔

متن:

عقیدہ: 17

اور بہشت و دوزخ موجود ہیں۔ قیامت کے دن حساب کے بعد ایک گروہ بہشت میں بھیجا جائے گا اور دوسرا گروہ دوزخ میں، اور ان (مومنوں) کے لئے ثواب اور (کفار کے لئے) عذاب دائمی و ابدی ہو گا جو کبھی ختم ہونے والا نہیں۔ جیسا کہ قطعی اور موکدہ نصوص اس امر پر دلالت کرتے ہیں۔

صاحب فصوص (شیخ محی الدین ابن عربی) کہتے ہیں کہ سب کا انجام "رحمت" ہے (جیسا کہ حق تعالیٰ نے فرمایا:)

﴿وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ﴾ (اعراف: 156)

"اور میری رحمت سب چیزوں کو گھیرے ہوئے ہے"

کفار کے لئے دوزخ کا عذاب تین حقبہ (ایک حقبہ اسی برس کی مدت) تک ثابت ہے۔ اور اس کے بعد کہتے ہیں کہ "آگ ان کے حق میں بَرْدًا وَّسَلَامًا (ٹھنڈی اور سلامتی والی) ہو جائے گی جیسا کہ حضرت ابراہیم علی نبینا و علیہ الصلوۃ و السلام پر ہو گئی تھی۔ وہ حق جل و علا کی وعید میں خلاف کرنے کو جائز سمجھتے ہیں اور وہ (صاحب فصوص) یہ کہتے ہیں کہ "اہل دل (صوفیہ) میں سے کوئی بھی کفار کے دائمی عذاب کی طرف نہیں گیا ہے"۔ اس مسئلہ میں بھی وہ راہ حق سے دور جا پڑے ہیں اور انہوں نے یہ نہیں جانا کہ مومنوں اور کافروں کے حق میں "وسعت رحمت" صرف اسی دنیا میں مخصوص ہے لیکن آخرت میں کافروں کو رحمت کی بو تک نہیں پہنچے گی جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿إِنَّهُ لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ إِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ﴾ (یوسف: 87)

"بے شک اللہ تعالیٰ کی رحمت سے سوائے کافروں کے کوئی مایوس (ناامید) نہ ہو گا"۔

جیسا کہ سبحانہٗ و تعالیٰ نے ﴿وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ﴾ کے بعد فرمایا ہے:

﴿فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَ يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ الَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ﴾ (اعراف: 156) "پھر میں اپنی رحمت کو ان لوگوں کے لئے لکھوں گا جو متقی ہیں اور زکوۃ دیتے ہیں، اور ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں"۔ شیخ (ابن عربی) نے آیت کے اول حصے کو تو پڑھ لیا اور آخری حصے کا مطالعہ نہ فرمایا۔ اور جیسا کہ حق تعالیٰ نے فرمایا: ﴿إِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ (اعراف: 56) "بے شک اللہ تعالیٰ کی رحمت محسنین کے قریب ہے"۔ نیز آیۂ کریمہ ﴿فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ رُسُلَهٗ﴾ (ابراہیم: 47) "پس ہر گز گمان نہ کرو کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں سے وعدہ خلافی کرے گا"۔ یہ آیت بھی وعدہ خلافی کی خصوصیت پر دلالت نہیں کرتی۔ ہو سکتا ہے کہ اس جگہ وعدہ خلافی کے نہ ہونے کا اقتصار و انحصار اس وجہ سے ہو کہ وعدے سے مراد رسولوں کی نصرت اور کفار پر ان کا غلبہ ہے اور یہ بات وعدہ و وعید دونوں کو متضمن ہے یعنی رسولوں کے لئے وعدہ ہے اور کفار کے لئے وعید لہذا اس آیت کریمہ میں بھی خلفِ وعدہ (وعدہ خلافی) کی نفی ہوتی ہے اور خلف وعید کی بھی نفی۔ فَالْآيَةُ مُسْتَشْهِدَةٌ عَلَيْهِ

لَاۤاَدَعَ "لهذا آیت مذکورہ شیخ کے خلاف ہے، تائید میں نہیں ہے"۔ اسی طرح خلف در وعید (وعید میں خلاف ہونا) بھی وعدہ خلافی کی مانند جھوٹ کو مستلزم ہے اور یہ حضرت جل سلطانہٗ کے شایان شان نہیں ہے کیونکہ وہ (حق تعالیٰ) ازل ہی میں جانتا تھا کہ کفار کو دائمی عذاب نہیں دوں گا۔ با وجود اس کے کسی مصلحت کی بنا پر اپنے علم کے خلاف فرما دیا کہ میں ان پر دائمی عذاب مسلط کر دوں گا۔ اس بات کو جائز کرنا نہایت ہی برا ہے ﴿سُبۡحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الۡعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوۡنَ﴾ (صافات: 180) "تمہارا بڑی عزت والا رب ان باتوں سے پاک ہے جو یہ بیان کرتے ہیں"۔

اور کفار کے لئے دائمی عذاب کے نہ ہونے پر اہلِ دل (صوفیہ) کا اجماع صرف شیخ کا اپنا کشف ہے اور کشف میں خطا اور غلطی کی بہت گنجائش ہے اور خصوصًا وہ کشف جو مسلمانوں کے اجماع کے مخالف ہو، اس لئے اس کا کچھ اعتبار و اعتماد نہیں ہے۔

تشریح:

خلود فی النار کا مسئلہ بہت ہی نازک ہے اور اس پہ شاید حضرت سید سلیمان ندوی کی بھی اس طرح کی کوئی بات گزری ہے۔ ان کو بھی اشکال تھا لیکن حضرت مولانا اشرف علی تھانوی صاحب سے بیعت ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کے اوپر یہ بات کھولی تو انہوں نے اس سے رجوع کر لیا۔ ان کے رجوع سے حضرت مولانا اشرف علی تھانوی صاحب کو اس کی اس قدر خوشی ہوئی تھی کہ فارسی میں اپنے مرید حضرت سید سلیمان ندوی کی شان میں با قاعدہ ایک غزل لکھی کیونکہ انہوں نے حق کی طرف رجوع فرما لیا تھا۔ بعض حضرات کو اشتباہ ہو جاتا ہے۔ ان کا دھیان اس طرح کی نصوص پہ پڑتا ہے کہ اللہ پاک کی رحمت اس کے غضب کے اوپر سبقت کرتی ہے ان کی ساری توجہ انہی نصوص پہ مرکوز ہو جاتی ہے دوسری نصوص ان کی نظر سے غائب ہو جاتی ہیں وہ مغلوب الحال ہو جاتے ہیں۔ اس مغلوب الحال ہونے میں وہ مقتدا تو نہیں رہتے کہ ان کی بات مانی جائے لیکن وہ خود معذور ہو جاتے ہیں۔ پھر جیسے ہی ان کو حق کا پتا چلتا ہے تو وہ رجوع کر لیتے ہیں جیسے حضرت سید سلیمان ندوی صاحب نے کیا۔ ممکن ہے حضرت شیخ اکبر نے بھی کیا ہو، کیونکہ بہت ساری باتوں میں بعض لوگ رجوع کر لیتے ہیں لیکن وہ رجوع مشہور نہیں ہو پاتا۔ اس وجہ سے

عین ممکن ہے کہ حضرت نے بھی اس سے رجوع فرما لیا ہو کیونکہ حضرت (مجدد الف ثانی) خود فرماتے ہیں کہ ان کی بعض باتوں سے تو ہم اختلاف کرتے ہیں لیکن ان کے مقامِ ولایت کو ہم مانتے ہیں کہ وہ ولی اللہ ہیں اور بڑے اونچے مقامات میں ہیں۔ یہ بات ہر آدمی نہیں کہہ سکتا، صرف حضرت مجدد صاحب ہی یہ بات کہہ سکتے ہیں۔

متن:

عقیدہ: 18

فرشتے خداوند جل سلطانہ کے بندے ہیں جو گناہوں سے پاک اور خطا و نسیان (بھول چوک) سے بھی محفوظ ہیں جیسا کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ﴾ (تحریم: 6) "اللہ تعالیٰ جو حکم ان کو کرتا ہے وہ اس میں اس کی نافرمانی نہیں کرتے اور وہی کرتے ہیں جو ان کو حکم ہوتا ہے"۔ وہ کھانے پینے سے اور مرد و زن ہونے سے منزہ اور مبرا ہیں۔ قرآن مجید میں ان کے لئے مذکر ضمیروں کا استعمال اس اعتبار سے ہے کہ صنف ذکور کو صنف نساء کے مقابلہ میں شرف حاصل ہے چنانچہ حق سبحانہٗ و تعالیٰ نے اپنی ذات کے لئے بھی مذکر ضمیروں کا استعمال کیا ہے۔ حضرت حق سبحانہٗ و تعالیٰ نے بعض (فرشتوں) کو رسالت کے لئے منتخب کیا ہے جیسا کہ بعض انسانوں کو رسالت کی دولت سے مشرف فرمایا ہے (جیسا کہ ارشاد ہے:) ﴿اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ﴾ (حج: 75) "اللہ تعالیٰ فرشتوں اور انسانوں میں سے بعض کو رسالت کے لئے منتخب فرما لیتا ہے"۔

جمہور علمائے اہل حق اس بات پر متفق ہیں کہ "خاص انسان خاص فرشتوں سے افضل ہیں"، لیکن امام غزالی، امام الحرمین اور صاحبِ فتوحات مکیہ رحمہم اللہ تعالیٰ اس بات کے قائل ہیں کہ خاص فرشتے خاص انسانوں سے افضل ہیں۔ جو کچھ اس فقیر پر ظاہر کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ فرشتے کی ولایت نبی علیہ الصلوۃ و السلام کی ولایت سے افضل ہے لیکن نبوت و رسالت میں نبی کے لئے ایسا درجہ ہے کہ جس تک فرشتہ نہیں پہنچا ہے اور وہ درجہ عنصر خاک کی وجہ سے ظاہر ہوا ہے جو بشر کے ساتھ مخصوص ہے۔ اس فقیر پر یہ بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ "کمالات ولایت" "کمالات نبوت" کے مقابلہ میں کسی گنتی میں نہیں ہیں۔ کاش کہ ان کے درمیان وہ نسبت ہی ہوتی جو قطرہ کو

دریائے محیط کے ساتھ ہے، مگر ایسا نہیں ہے۔ پس وہ فضیلت جو نبی کو نبوت کی وجہ سے حاصل ہوئی ہے وہ اس فضیلت سے کئی گنا زائد ہے جو ولایت کی وجہ سے حاصل ہو، لہذا "فضیلتِ مطلق" انبیائے کرام علیہم الصلوات و التسلیمات کا حصہ ہے اور جزئی فضیلت ملائکہ کرام کے لئے ہے۔ پس درست وہی ہے جو علمائے کرام **شَکَّرَاللّٰہُ تَعَالٰی سَعْیَھُمْ** نے فرمایا ہے۔ اس تحقیق سے یہ ظاہر ہو گیا کہ انبیاء علیہم الصلوات و التسلیمات کے درجات میں سے کسی نبی کے درجے تک کوئی ولی نہیں پہنچتا بلکہ اس ولی کا سر ہمیشہ اس نبی کے قدم کے نیچے ہوتا ہے۔

جاننا چاہیے کہ ان مسائل میں سے ہر ایک مسئلہ میں جن میں علما اور صوفیا کا اختلاف ہے، جب اچھی طرح غور اور ملاحظہ کیا جاتا ہے تو حق علما کی جانب معلوم ہوتا ہے اور اس کا راز یہ ہے کہ علما کی نظر نے انبیاء علیہم الصلوات و التسلیمات کی متابعت کے باعث نبوت کے کمالات اور اس کے علوم میں نفوذ کیا ہے، اور صوفیا کی نظر ولایت کے کمالات اور اس کے معارف تک محدود رہتی ہے۔

تشریح:

یعنی صوفیا پر جو منکشف ہوتا ہے وہی دیکھتے ہیں۔ علماء منکشف ہونے والی بات کی طرف جاتے ہی نہیں بلکہ وہ تو قرآن و حدیث کی بات جانتے ہیں۔

متن:

لہذا وہ علم جو نبوت کی مشکوٰۃ سے حاصل کیا جائے وہ لازمًا اس علم سے جو مرتبہ ولایت سے اخذ کیا گیا ہو کئی درجے زیادہ صحیح اور حق ہو گا۔ ان معارف میں سے بعض کی تحقیق اس مکتوب (دفتر اول مکتوب 260) میں جو فرزندی ارشدی (خواجہ محمد صادق) کے نام طریقے کے بیان میں لکھا ہے درج ہو چکی ہے، اگر کچھ دقت اور پوشیدگی رہ گئی ہو تو اس (مکتوب کی طرف) رجوع کریں۔

عقیدہ: 19

ایمان سے مراد جو کچھ دینی امور سے متعلق ضرورت اور تواتر کے طریق پر ہم تک پہنچا ہے اس کی دل سے تصدیق کرنا ہے۔ زبان سے اقرار کرنا بھی ایمان کا رکن

ہے جیسا کہ (علما نے کہا ہے) کہ اس کے بغیر (ایمان کے) منہدم ہونے کا احتمال ہے، اور اس علامت کی تصدیق کفر سے تبری کرنا اور کافری سے اور جو کچھ کافری کے لوازم و خصائص ہیں جیسے زنار کا باندھنا اور اس کی مانند وغیرہ سے بے زاری کا اظہار کرنا ہے۔ اللہ سبحانہٗ کی پناہ! اگر کوئی تصدیق کا بھی دعوی کرے اور کفر سے بے زاری کا اظہار نہ کرے تو وہ دو دینوں کی تصدیق کرنے والا بن جائے گا جو ارتداد کے داغ سے داغ دار ہو گا اور حقیقت میں اس کا حکم منافق کے حکم میں ہے: ﴿لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ﴾ (نساء: 143) "نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے" لہذا ایمان کی تحقیق میں کفر سے تبری (بیزاری کا اظہار) کئے بغیر چارہ نہیں۔ تبری کا ادنیٰ درجہ دل سے بے زاری کرنا ہے اور تبری کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ دل اور جسم دونوں سے ہو، اور تبری سے مراد حق جل و علا کے دشمنوں کے ساتھ دشمنی رکھنا ہے۔ خواہ دشمنی قلب سے ہو جب کہ ان سے نقصان پہنچنے کا خوف ہو، خواہ دل اور جسم دونوں سے ہو جب کہ ان سے ضرر کا خوف نہ ہو۔ آیۃ کریمہ ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ﴾ (توبہ: 73) "اے نبی! کفار اور منافقین سے جہاد کرو اور ان کے ساتھ سختی سے پیش آؤ" اس مضمون کی تائید کرتی ہے کیونکہ خدائے عز و جل کی محبت اور اس کے رسول علیہ و علی آلہ الصلوات و التسلیمات کی محبت ان کے دشمنوں کی دشمنی کے بغیر صورت پذیر نہیں ہوتی۔ اس جگہ یہ مصرع صادق آتا ہے۔

تولی بے تبری نیست ممکن

"حب حق کے واسطے ہے غیر سے نفرت ضرور"۔

شیعہ (فرقہ) نے جو یہ قاعدہ اہل بیت کی محبت اور دوستی میں جاری کیا ہے اور تینوں خلفا اور ان کے علاوہ اکثر صحابہ سے تبری کرنا اہل بیت کی دوستی کی شرط قرار دیا ہے، نا مناسب ہے کیونکہ دوستوں کی محبت کے لئے شرط ہے کہ ان کے دشمنوں سے تبری کیا جائے، نہ کہ مطلق طور پر دشمنوں کے علاوہ دوسروں سے بھی ہو اور کوئی عقلمند منصف اس بات کی تجویز نہیں کرتا کہ پیغمبر علیہ و علیہم الصلوات و التسلیمات کے اصحاب پیغمبر علیہ و علیہم الصلوات و التسلیمات و التحیات کے اہلِ بیت کے دشمن ہوں، حالانکہ ان بزرگواروں نے آپ علیہ و علی آلہ الصلوۃ و السلام کی محبت میں اپنے اموال

اور جانوں کو صرف کر دیا اور اپنی عزت و حکومت کو برباد کر دیا تو اہل بیت سے ان کی دشمنی کس طرح منسوب کی جا سکتی ہے، جب کہ نص قطعی سے آنسرورِ عالم علیہ و علیہم الصلوات و التسلیمات کے قرابت داروں کی محبت ثابت ہے۔ اور دعوت کی اجرت کو ان کی محبت قرار دیا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى﴾ (شوریٰ: 23) "آپ ان سے کہہ دیجئے کہ میں تم سے اہلِ قرابت کی دوستی کے علاوہ کوئی بدلہ نہیں چاہتا"۔

اور حضرت ابراہیم خلیل الرحمٰن علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کو جو یہ بزرگی حاصل ہوئی اور "شجرہ انبیاء" بن گئے، یہ سب اس تعالیٰ کے دشمنوں کے ساتھ (علی الاعلان) تبری کرنے کی وجہ سے ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ﴾ (ممتحنہ: 4) "تمہارے لئے ابراہیم (علیہ و علی نبینا الصلوۃ و السلام) میں اور ان لوگوں میں جو ان کے ساتھ تھے ایک عمدہ نمونہ ہے جب کہ انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ ہم تم سے اور جن کی تم اللہ کے سوا عبادت کرتے ہو ان سے بے زار ہیں، اور ہم تمہارے منکر ہیں اور ہم میں اور تم میں ہمیشہ کے لئے عداوت اور بغض ظاہر ہو گیا جب تک تم اللہ واحد پر ایمان نہ لاؤ"۔

اس فقیر کی نظر میں "رضائے حق جل و علا" حاصل کرنے کے لئے اس تبری (بے زاری) کے اظہار کے برابر کوئی عمل نہیں ہے۔ (یہ فقیر اپنے ذوق میں پاتا ہے کہ حضرت حق سبحانہٗ و تعالیٰ کو کفر و کافری کے ساتھ ذاتی عداوت ہے۔ اور یہ آفاقی اِلٰہ مثلاً لات و عزیٰ اور ان کی پوجا کرنے والے ذاتی طور پر حق جل سلطانہٗ کے دشمن ہیں، اور دوزخ کا دائمی عذاب اس برے فعل کی سزا ہے۔ خواہشِ نفسانی کے اِلٰہ اور تمام برے اعمال یہ نسبت نہیں رکھتے کیونکہ ان کی عداوت اور غضب ذاتی نسبت سے نہیں ہے۔ اگر غضب ہے تو وہ صفات کی طرف منسوب ہے اور اگر عقاب و عتاب (عذاب و غصہ) ہے تو افعال کی طرف راجع ہے، لہٰذا دوزخ کا دائمی عذاب ان کے گناہوں کی سزا نہیں ہوئی بلکہ (حق تعالیٰ نے) ان کی مغفرت کو اپنی مشیت اور ارادے پر منحصر رکھا ہے۔

جاننا چاہیے کہ جب کفر اور کافروں کے ساتھ ذاتی عداوت کی تحقیق ہو چکی تو لازماً رحمت و رافت جو "صفات جمال" میں سے ہے آخرت میں کافروں کو نہ پہنچے گی، اور رحمت کی صفت ذاتی عداوت کو دور نہیں کرے گی۔ کیونکہ جو چیز ذات کے ساتھ تعلق رکھتی ہے اس چیز کی نسبت جو صفت سے تعلق رکھتی ہے زیادہ قوی اور بلند ہے، لہذا مقتضائے صفت (صفت کے تقاضے) مقتضائے ذات کو تبدیل نہیں کر سکتے اور یہ جو حدیث قدسی میں آیا ہے: "سَبَقَتْ رَحْمَتِیْ عَلٰی غَضَبِیْ" "میری رحمت میرے غضب پر سبقت لے گئی"۔ اس غضب سے مراد غضبِ صفاتی سمجھنا چاہیے جو گنہگار مومنوں کے ساتھ مخصوص ہے نہ کہ غضبِ ذاتی جو مشرکوں کے ساتھ مخصوص ہے۔

تشریح:

یہاں حضرت نے بہت زبر دست دلیل دی ہے جس سے ساری بات بالکل واضح ہو گئی ہے لیکن اس کے لئے تمہید بہت لمبی باندھی ہے۔ اختصار کے ساتھ اس کو یوں سمجھ لیں کہ ایمان بنیاد ہے اس لئے کہ اس کا تعلق ذات کے ساتھ ہے اور اعمال کا تعلق صفات کے ساتھ ہے لہٰذا جو ایمان نہیں لاتے، ان کی ذات کے ساتھ دشمنی ہے، صفات والی رحمت اس دشمنی کو ختم نہیں کرے گی۔

ما شاء اللہ حضرت مجدد صاحب کو اللہ پاک نے علمِ کلام کی بڑی گہرائی نصیب فرمائی تھی، دلائل میں مسلسل قرآن و حدیث چل رہے ہیں، کشفیات کبھی کبھی آتے ہیں، جیسے ابھی آگے ذکر آ رہا ہے کہ ایک صاحب مرض الموت میں مبتلا تھے، مجھے کہا گیا کہ آپ اس پہ ذرا توجہ کریں، میں نے توجہ کی مگر توجہ کام نہیں کر رہی تھی تو میں حیران ہو گیا۔ وجہ پوچھنے پر بتایا گیا کہ اس کی کافروں کے ساتھ دوستی تھی، تمہاری توجہ اس کو دور نہیں کر سکتی۔ اس کا علاج عذاب جہنم ہی ہے۔

کافروں کے ساتھ دوستی بڑی مہنگی پڑتی ہے اس لئے کافروں کے ساتھ دوستی نہیں ہونی چاہیے۔ مدارات والی بات الگ ہے لیکن دوستی ہونا ٹھیک نہیں ہے۔ ہم کسی کافر کو یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ میرا دوست ہے، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْیَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓی اَوْلِیَآءَ﴾ (المائدۃ: 51)

ترجمہ: " اے ایمان والو ! یہودیوں اور نصرانیوں کو یار و مدد گار نہ بناؤ"۔

یعنی ان کے ساتھ دوستی نہیں ہو سکتی کیونکہ ان کی اللہ سے ذاتی طور پہ عداوت ہے لہٰذا وہ صفات والی رحمت اس کو عذاب سے نہیں روک سکتی۔ صفات والی رحمت اعمال کے لحاظ سے ہے، یہ رحمت صرف اعمال کے اندر کام کرے گی۔ صحیح بات یہ ہے کہ اللہ جل شانہٗ نے قرآن میں جو فرمایا ہے:

﴿وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ﴾ (الشوریٰ: 30)

ترجمہ: "اور بہت سے کاموں سے تو وہ در گزر ہی کرتا ہے"۔

اس ارشاد کی برکت سے تھوڑی سی بچت ہے ورنہ اگر برابر برابر معاملہ ہوتا تو کوئی نہیں بچ سکتا تھا۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی صاحب نے ایک جگہ ارشاد فرمایا ہے کہ ہم تو انتظامی طور پر باتیں کرتے ہیں ورنہ وہاں تو ایسے ایسے لوگوں کی مغفرت ہو گی جن کو ہم واقعی کافر سمجھتے ہوں گے لیکن وہ اللہ کے نزدیک کافر نہیں ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ جن پر یہ باتیں کھولتے ہیں وہ انتظامی بات تو کرتے ہیں لیکن دل میں اس کو نہیں رکھتے، ان کو پتا ہوتا ہے کہ جس کے ساتھ معاملہ ہے وہ بہت کریم ذات ہے، اس کا معاملہ سب کے ساتھ بالکل الگ ہے۔ اگر خدا نخواستہ کسی کے ساتھ ہماری نرمی کی وجہ سے ان کو نقصان ہو رہا ہے تو پھر ہم سختی کریں گے لیکن وہ سختی انتظامی ہو گی اور وہ اس لئے بھی ضروری ہوتی ہے کہ گناہوں کی کثرت ایمان کو سلب کرنے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ اس لئے اگر آپ اس کو انتظامی طور پہ نہیں روکیں گے تو وہ ذاتی دشمنی میں چلا جائے گا اور اس کو صفات والی بات سنبھال ہی نہیں سکے گی۔ لہٰذا آپ کے لئے ان کو موت سے پہلے پہلے روکنا ضروری ہے۔

ہمارے دفتر میں ایک آدمی تھے جو بڑے نیک انسان تھے، ان کے معاملات بہت شفاف تھے لیکن عبادات یعنی نماز وغیرہ میں سستی کرتے تھے۔ ہمارا ارادہ تھا کہ کسی طریقے سے ان کو بات پہنچا دیں گے اور دوستی کے ناتے ان کے ساتھ کسی وقت بیٹھ کر ان سے بات چیت کریں گے، ممکن ہے کہ وہ مان جائیں۔ لیکن ایک دن اچانک ان کو دل کا دورہ پڑا اور وہ فوت ہو گئے۔ اس وقت ان کی عمر صرف 43 سال تھی۔ کچھ دنوں بعد میں نے انہیں خواب میں دیکھا، میں نے پوچھا کہ آپ کا کیا حال ہے؟ کہنے

لگے کہ میں تم سے اور یوسف سے ناراض ہوں، میں نے کہا کیا مسئلہ ہو گیا؟ جواب دیا کہ تم لوگوں نے مجھے سمجھایا کیوں نہیں؟ پھر فرمایا کہ ایک دفعہ میرا حساب ہو گیا ہے لیکن اس میں کچھ مسائل ہیں، اب پرسوں دوبارہ حساب ہو گا، میں نے سوچا کہ ان کی بات تو بالکل صحیح ہے کیونکہ ہم ان کو نہیں کہہ سکے تھے۔ اس خفت کی وجہ سے میں نے ان سے کہا کہ میں آپ کے لئے ابھی ایصالِ ثواب کر دیتا ہوں، چنانچہ میں نے خواب میں ہی ایک دفعہ سورۂ فاتحہ اور تین دفعہ سورۂ اخلاص پڑھ کے اس کا ثواب ان کو بخش دیا۔ جب بیدار ہوا تو میں نے یوسف صاحب کو سارا قصہ سنایا، یوسف صاحب بھی بہت پریشان ہو گئے کہ اس کا شکوہ تو بالکل بجا ہے، واقعتاً ہم سے سستی ہو گئی، چنانچہ انہوں نے بھی ان کے لئے ایصالِ ثواب کروا دیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ جن کے ساتھ میری دوستی ہے اس کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ میں ان کے غلط اعمال دیکھ کر در گزر کا معاملہ کروں، بلکہ دوستی کا حق یہ ہے کہ میں ان کو روکوں تاکہ وہ بچ جائیں۔ ورنہ اگر وہ کفر کی طرف چلے گئے تو ہماری پہنچ سے معاملہ نکل جائے گا۔ اس وجہ سے گناہ گاروں کے ساتھ نرمی و ملائمت اپنی جگہ لیکن دین پر لانے کے لئے کچھ نہ کچھ انتظام ہونا چاہیے، اللہ پاک ہم سب کو سمجھ کی توفیق عطا فرمائے

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ۝

مقامات قطبیہ ومقالات قدسیہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی خَاتَمَ النَّبِیِّیْنَ

اَمَّا بَعْدُ ۞ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۞

حضرت کاکا صاحب کے مقاماتِ قدسیہ کے بارے میں ان کے صاحبزادہ حضرت مولانا عبد الحلیم صاحب اپنی کتاب "مقاماتِ قطبیہ و مقالاتِ قدسیہ" میں اولیاء اللہ کی قسمیں بتاتے ہوئے رقم طراز ہیں:

متن:

پس اے میرے پیارے! بعض کو مقامِ ولایت سے مقامِ فردانیت تک پہنچایا جاتا ہے۔ اور یہ مقام مشائخ کا مقامِ اوّل ہے۔ ورنہ عام طور پر مشائخ وہ ہوتے ہیں کہ ولایت سے قطبیت اور پھر وہاں سے مقام فردانیت کو پہنچائے جاتے ہیں۔ پس اے میرے پیارے! وہ افراد جو کہ قطبِ مدار یعنی قطبِ عالم سے افضل اور بہتر ہیں ہمیشہ اور دائمی طور پر تجلیٔ ذات میں محو ہوتے ہیں، لیکن مخلوق اور اہل ظاہر ان کو عالم محو میں سمجھتے ہیں، لیکن وہ محو عظیم ہوتا ہے۔ اور افراد کے قالب (جسم) بشریت کے لباس میں مشابہت اور تمثیل کے طور پر اہل ظاہر کو نظر آتے ہیں، لیکن حقیقت میں یہ نورِ ذات میں محو اور فنا ہوتے ہیں۔ نہ تو وہاں مکان ہوتا ہے اور نہ زمان (یعنی اہل مکان و زمان) یعنی اہلِ تجلیٔ صفات افعال اور آثار کی تجلیات کے لیے کوئی افراد کی تجلی نہیں ہوتی۔ بلکہ اُن کے لیے مشاہدہ بھی نہیں، جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا۔ پس جو کوئی اس مقام تک رسائی حاصل کرے وہ خود سمجھ جائے گا۔ یہ عام لوگ اور اہل ظواہر شیخی اور درویشی کو اس بات میں سمجھتے ہیں کہ چند رکعت نماز پڑھ لی جائے، یا چند روز تک خلوت میں بیٹھا رہے یا چند دن بھوکا پیاسا رہے۔ خدا کی قسم ان تمام توہمات اور خیالات سے حقیقت دور ہے۔ اور جناب حضرت شیخ رحمکار صاحب قطبِ حقیقی تھے۔ اور آپ تجلیٔ ذات سے متجلی اور منور تھے۔ پس اے میرے پیارے! **صاحبِ فصوص الحکم** تحریر فرماتے ہیں کہ منصور حلاج کو تجلیٔ ذات حاصل تھی اور فردانیت کے مقام کو پہچانتا تھا۔ لیکن محمد

حسین بن نصیر الدین جو کہ بحر المعانی کے مصنف ہیں فرماتے ہیں کہ اگر منصور حلاج کو تجلی ذات حاصل ہوتی تو وہ "اَنَاالْحَقُّ" کبھی نہ کہتے۔ اور ذکر سبحانی نہ الاپتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تجلیٔ ذات میں محویت ہوتی ہے، اور جو محو ہو جائے تو اس کو کیا خبر ہوتی ہے کہ وہ کون ہے اور کیا چیز ہے؟ پس "اَنَاوَاِنَّا" (میں اور ہم وغیرہ) سے مراد اپنی حقیقت کو سمجھنا اور بیان کرنا ہے۔ پس وہ مقامِ محویت میں کب اور کیسے ہوتا ہے کہ جب کہتا ہے کہ میں اور ہم۔ یعنی میں ایسا ہوں اور ہم ایسے ہیں۔ پس اے میرے پیارے! تجلیٔ ذات میں کلام کرنا نہیں ہوتا۔ جیسا کہ سرور عالم رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ "مَنْ عَرَفَ رَبَّهٗ كَلَّ لِسَانُه" یعنی جو شخص اپنے رب کی معرفت حاصل کر لیتا ہے، تو اس کی زبان بند ہو جاتی ہے۔

تشریح:

اس مقام کے بارے میں حضرت مجدد الف ثانی نے بھی بات کی ہے۔ اسم ظاہر کی تجلی میں اللہ جل شانہ کی طرف سے بندے پر مختلف چیزیں ظاہر ہوتی رہتی ہیں جن کے ذریعے بندہ اللہ تعالیٰ کی معرفت تک پہنچ جاتا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہوتی ہے تو بندہ اس کے اندر ایسا محو ہو جاتا ہے کہ پھر اسے کسی چیز کی خبر نہیں رہتی یہاں تک کہ وہ اپنا آپ بھی بھول جاتا ہے۔ وہ مسلسل ایک ایسی محویت کے عالم میں رہتا ہے جس میں اسے کسی اور چیز کا ادراک نہیں ہوتا۔ اسی بات کو یوں فرمایا گیا کہ جس نے اپنے رب کو پہچان لیا اس کی زبان گنگ ہو گئی یعنی وہ کلام نہیں کر سکتا۔ کلام نہ کر سکنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ مقام حیرت میں ہوتا ہے، وہ جو دیکھ رہا ہوتا ہے اس کو بیان نہیں کر سکتا۔ ایسے حضرات مخلوق کے درمیان تو رہتے ہیں مگر لوگوں کے ساتھ وہی باتیں کرتے ہیں جنہیں لوگ سمجھ سکیں، اپنی معرفت کے مطابق بات نہیں کرتے۔

حضرت علی کا قول ہے: "كَلِّمُوا النَّاسَ عَلٰى قَدْرِ عُقُوْلِهِمْ"

ترجمہ: "لوگوں کے ساتھ ان کی عقلوں کے مطابق بات کرو"۔

کیونکہ اگر ان کی عقل سے باہر کی کوئی بات کی گئی تو لوگوں میں ذہنی انتشار پیدا ہو گا جس سے بجائے فائدہ کے ان کو نقصان ہو گا۔ اس وجہ سے ایسے حضرات گفتگو کم کر دیتے ہیں اور بعض حضرات بالکل ہی خاموش ہو جاتے ہیں۔ حضرت تھانوی صاحب

پر بھی یہ حالت گزری تھی۔ حضرت نے ان دنوں وعظ کرنا چھوڑ دیا تھا۔ لوگ ان کے استاذ حضرت مولانا یعقوب نانوتوی کے پاس آئے اور کہا کہ ان کے مواعظ سے لوگوں کو بڑا فائدہ پہنچتا تھا لیکن انہوں نے وعظ کرنا بند کر دیا ہے اس کی کیا وجہ ہے؟ حضرت مولانا یعقوب صاحب نے حضرت تھانوی صاحب کو بلا کر دریافت کیا کہ وعظ کرنا کیوں موقوف کر دیا ہے؟ حضرت تھانوی صاحب ان کے سامنے رونے لگ گئے، کچھ کہہ نہ سکے۔ حضرت مولانا یعقوب صاحب ان کی حالت سمجھ گئے اور لوگوں سے کہا کہ ان کو چھوڑ دو، اِس وقت ان سے کوئی بات نہ کرو، اِس وقت ان کی حالت ایسی ہے کہ اگر منبر پہ بیٹھ گئے تو پہلی بات جو ان کی زبان سے نکلے گی وہ "اَنَا الحَق" کا کلمہ ہو گا۔ بعد میں جب افاقہ ہوا تو لوگوں نے حضرت سے پوچھا کہ یہ کیا بات تھی؟ فرمایا: مجھ پر توحید کا غلبہ ہو گیا تھا۔

متن:

اور اس "**عَرَفَ**" سے مراد تجلیٔ ذات ہے، لیکن تجلیٔ صفات اور تجلیٔ اسماء و آثار میں کلام کرنا جائز ہوتا ہے جیسا کہ فرمایا گیا ہے "**مَنْ عَرَفَ رَبَّهٗ طَالَ لِسَانُهٗ**" یعنی جو اپنے رب کی معرفت کی سعادت سے مشرف ہو جاتا ہے تو اس کی زبان لمبی ہو جاتی ہے۔

تشریح:

زبان لمبی ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ زیادہ بات کرے گا۔ اسم ظاہر کا اثر یہی ہوتا ہے کہ سالک کو بہت کچھ نظر آ رہا ہوتا ہے یا یوں کہہ لیجئے کہ اس کو اتنا کچھ دکھایا جا رہا ہوتا ہے کہ وہ بیان کرتے کرتے تھک جاتا ہے لیکن اس کے مشاہدات کا بیان ختم نہیں ہوتا۔ بعد ازاں جب وہ تجلی ذات میں آ جاتا ہے تب اس کی زبان گنگ ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ جل شانہ کی ذات الفاظ کے دائرے میں نہیں آ سکتی۔ الفاظ کے ذریعے اللہ پاک کی تجلیوں کا بیان ممکن نہیں ہے۔ تجلی کا احساس تو ہر شخص کو اپنی معرفت کے مطابق ہو سکتا ہے مگر اس کا بیان ممکن نہیں ہے۔ آپ ﷺ نے خود فرمایا ہے کہ اللہ پاک کی مخلوقات میں غور کرو اللہ پاک کی ذات میں غور مت کرو، وہ وراء الورا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو کوئی دیکھ نہیں سکتا۔ قرآن شریف میں نصِ صریح سے ثابت ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: اے اللہ مجھے اپنا دیدار کرا دے۔ اللہ پاک نے

ان سے فرمایا: تو ہر گز مجھے نہیں دیکھ سکتا۔ لہٰذا اس دنیا میں تو انسان اللہ کو نہیں دیکھ سکتا، ہاں تجلیات کے اندر غرق ضرور ہو سکتا ہے اور اسی کو معرفت کہا گیا ہے۔ جب کسی کو یہ تجلّی ذات حاصل ہوتی ہے تو اس کی زبان گنگ ہو جاتی ہے۔

متن:

جو اپنے رب کی معرفت کی سعادت سے مشرف ہو جاتا ہے تو اس کی زبان لمبی ہو جاتی ہے۔ اس حدیث سے تجلّیٔ صفات وغیرہ مراد ہیں۔ اس بات میں خوب غور و فکر سے کام لو کہ جب تجلّیٔ ذات کے درمیان کلام ہو تو تجلّیٔ ذات میں "**سُبْحَانِیْ**" اور "**أَنَاالْحَقُّ**" کہنا مناسب نہیں اور ہر گز جائز نہیں۔ پس معلوم ہوا کہ یہ کلام وغیرہ تجلّیٔ صفات کے دوران ہوگا اور محمد حسین بن نصیر الدین فرماتے ہیں کہ جب میں اس مقام میں تھا تو اس فقیر کے ساتھ اتنی باتیں ہوئیں اور یہ فقیر بھی جواب دیتا تھا کہ اُس کی کوئی انتہا نہ تھی۔ اگر تجلّیٔ صفات وغیرہ میں کلام نہ ہو تو ہلاکت کا خوف ہوتا ہے اور اسی محمد حسین صاحب نے یہ مثنوی کہی ہے جو کہ تجلّیٔ صفات کے مقام سے کہی گئی ہے۔ مثنوی:

بحر جان چوں زدہ صد گونہ جوش
چوں توانم بود بیک ساعت خموش
جوں کہ غرق آتشم غیبم مکن
مے بسوزیم گر نمی گویم سخن پس مے از گوش

"روح اور جان کا سمندر جب طغیانی اور جوش میں آتا ہے تو ایک گھڑی بھر کے لیے میں کیسے چپ رہ سکتا ہوں؟ چونکہ آگ میں ڈوبا ہوا ہوں تو اگر میں بات نہ کروں تو میں جل جاتا ہوں۔ یہ بات کان کھول کر سنو"

پس اے میرے پیارے! "**أَنَاالْحَقُّ**" اور "**سُبْحَانِیْ**" کی شرح یہ ہے کہ جب سالک تجلّیٔ صفات میں مستغرق ہوتا ہے تو صفات کے جمال کی وجہ سے اپنے آپ کو بھی انہیں صفات میں (موصوف) دیکھتا ہے۔ یعنی ذات جاذب الوجود، واجب الوجود کی صفات میں اُن صفات کے جمال کے نور میں مستغرق ہو جاتا ہے۔ اور واجب الوجود

(اللہ تعالیٰ) کی صفات جذبیت میں آتی ہیں۔ جاذب الوجود (سالک) کا وجود مجذوب ہو کر کلام کرنے لگ جاتا ہے۔ "سُبْحَانِیْ" اور "أَنَا الْحَقُّ" مجذوب نہیں کہتا ہے بلکہ وہی صفاتِ واجب الوجود (اللہ تعالیٰ) جاذب الوجود (سالک) کی زبان سے فرماتا ہے جیسا کہ سید الکونین رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ "إِنَّ اللهَ تَعَالٰی جَعَلَ الْحَقَّ عَلٰی لِسَانِ عُمَرَ"

ترجمہ: تحقیق اللہ تعالیٰ نے حضرت عمر کی زبان میں حق رکھ دیا ہے۔

محمد حسین نے کہا ہے کہ اے میرے محبوب! جو شرح کہ اس فقیر نے نقل کی ہے۔ تو یہ شرح اُن لوگوں سے پوچھی جائے جو "أَنَا الْحَقُّ" اور "سُبْحَانِیْ" کہہ چکے ہیں تو وہ خود بھی اس کی شرح نہیں کر سکتے۔ اور اس کو واضح طور پر بیان نہیں کر سکتے۔ خدائے برتر و توانا کی قسم کہ اس کی شرح بیان کرنے سے وہ عاجز ہوتے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اولیاء اللہ میں سے کسی نے بھی اس کی شرح بیان نہیں کی ہے۔ پس اہل ظاہر یہ کلام مجذوب کی جانب سے تصور کر کے اُس کو ضرر پہنچاتے ہیں۔

تشریح:

میں آپ کو اس بارے میں ایک واقعہ سناتا ہوں۔ حضرت تھانوی صاحب کو اللہ تعالیٰ نے بات سمجھانے کا ڈھنگ عطا فرمایا تھا لہذا حضرت بڑی نازک بات کو بھی بڑے اچھے طریقے سے سمجھا دیتے تھے۔ لکھتے ہیں کہ ایک بزرگ کے پاس ایک عورت اپنے بچے کو لے کر آئی کہ یہ نابینا ہے اس پر دم فرما دیں تاکہ یہ بینا ہو جائے۔ اس وقت ان بزرگ پر غلبۂ حال طاری تھا، انہوں نے جواب دیا کہ میں کوئی موسیٰ یا عیسیٰ ہوں کہ نابینا کو بینا کر دوں؟ جاؤ اپنا کام کرو۔ وہ عورت روتی ہوئی واپس چلی گئی۔ اتنے میں حضرت کو اللہ کی طرف سے الہام ہوا کہ موسیٰ کون اور عیسیٰ کون، یہ سب کام تو میں کرتا ہوں۔ یعنی موسیٰ نے یہ کام نہیں کئے، عیسیٰ نے یہ کام نہیں کئے یہ تو میں نے کئے ہیں۔ اگر عیسیٰ علیہ السلام نے کسی کو زندہ کیا یا کسی نابینا کو بینا کر دیا ہے تو یہ ان کا کام تھوڑی ہے یہ تو میرا (اللہ پاک) کا کام ہے۔

ان بزرگ کو یہ الہام ہوا۔ اب ہوتا یہ ہے کہ عاشق الہام کو بڑے مزے سے سنتا ہے اور اسے دہرانے لگتا ہے۔ محبوب کا کلام دہرانے میں اسے بڑا مزہ آتا ہے۔ ان بزرگ کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ ان کے دل پر یہ الفاظ الہام کئے گئے کہ "موسیٰ

کون اور عیسیٰ کون؟ یہ سب تو میں کرتا ہوں"۔ اس پر انہیں تنبیہ تو ہو گئی لیکن اس تنبیہ کے ساتھ انتہائی خوشی بھی تھی کہ اللہ پاک نے مجھ سے الہامی طور پہ بات کی ہے۔ اس خوشی میں آ کر وہ اس عورت کی طرف بھاگے اور یہ کہتے جاتے تھے کہ "موسیٰ کون عیسیٰ کون یہ تو میں کرتا ہوں، موسیٰ کون عیسیٰ کون یہ تو میں کرتا ہوں"۔ اس عورت کے پاس پہنچے اور یہ کلمات دہراتے ہوئے نابینا بچے کے چہرے پہ ہاتھ پھیرنے لگے اور وہ بینا ہو گیا۔

اب اگر لوگ اس بزرگ سے پوچھتے کہ آپ یہ کیا کہہ رہے تھے تو وہ بتا دیتے کہ میں تو وہ الفاظ دہرا رہا تھا جو میرے دل پہ وارد ہوئے تھے اور میری زبان پہ جاری ہو گئے تھے میں انہی کو دہرائے جا رہا تھا۔

وہ بزرگ اس وقت مقام عروج میں تھے اور مقام عروج میں کشف اور کرامتیں بہت زیادہ ظاہر ہوتی ہیں، ان کی کرامت ظاہر ہو گئی جس کے ذریعے وہ بچہ بینا ہو گیا۔ ایسے واقعات کے پیچھے ایک پوری تفصیل ہوتی ہے لیکن اسے لوگ نہیں سمجھتے اور غلطی کا شکار ہو جاتے ہیں۔

حضرت تھانوی صاحب نے ایک اور واقعہ لکھا ہے کہ ایک آدمی مسلسل یہ کہے جا رہا تھا کہ نہ تو میرا خدا نہ میں تیرا بندہ پھر میں تیری بات کیوں مانوں، نہ تو میرا خدا نہ میں تیرا بندہ پھر میں تیری بات کیوں مانوں۔ اس بات پہ لوگ اسے برا بھلا کہہ رہے تھے، گالیاں دے رہے تھے اور پتھر پھینک رہے تھا لیکن وہ اپنی مستی میں یہ بات کہے جا رہا تھا۔ اسی اثنا میں ایک بزرگ تشریف لائے انہوں نے یہ سارا ماجرا دیکھا اور اس آدمی کے پاس جا کر غور سے سنا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے، پھر اس سے پوچھا کہ آپ یہ کیوں کہہ رہے ہیں اور کس کو کہہ رہے ہیں؟ اس نے آنکھیں کھولیں اور کہا: الحمد للہ ایک عقلمند سے ملاقات ہو گئی، در اصل میرا نفس کسی برائی کا تقاضا کر رہا ہے اس لئے میں اپنے نفس سے کہہ رہا ہوں کہ نہ تو میرا خدا ہے نہ میں تیرا بندہ پھر میں تیری بات کیوں مانوں۔

اس بزرگ نے کہا کہ حضرت آپ بات تو صحیح کر رہے ہیں لیکن جگہ آپ نے غلط منتخب کی ہے، مہربانی کر کے آپ یہ بات اپنے نفس سے گھر میں بیٹھ کر کہہ دیا کریں

تاکہ عوام پریشان نہ ہوں۔ یہ سن کر اس آدمی نے چادر اٹھا کے کندھے پہ ڈالی اور یہ کہتے ہوئے گھر کی طرف چل پڑا کہ عقلمند کی بات ماننی چاہیے۔

غور فرمائیں باقی لوگ ان کو کیا سمجھ رہے تھے لیکن جس نے تحقیق کی اسے معلوم ہو گیا کہ اصل بات کیا ہے۔ لوگ کسی بھی بات کا فیصلہ کرنے میں جلدی کرتے ہیں بلکہ کئی مرتبہ تو ایسا ہوتا ہے کہ کسی شخص کے دل میں جو سوچ اپنے بارے میں ہوتی ہے دوسرے پر بھی وہی گمان کرتا ہے۔ عموماً لڑائیاں ایسے ہی ہوتی ہیں کہ ایک آدمی نے بڑی اچھی نیت کے ساتھ ایک کام کیا لیکن کوئی ایسا آدمی جو بد نیت ہے وہ اس کام کو بھی بد نیتی پر محمول کر کے اس کے مخالف ہو جائے گا۔ اگر وہ اپنی سوچ کے مطابق فیصلہ کرنے سے پہلے اس سے پوچھ لیتا تو معلوم ہو جاتا کہ اس نے بڑی اچھی نیت کے ساتھ یہ کام کیا تھا۔ عموماً ایسا ہی ہوتا ہے کہ جو انسان خود غلط سوچ کا مالک ہوتا ہے وہ دوسرے کے بارے میں بھی غلط سوچنے لگتا ہے۔ جس نے پاکی دیکھی نہیں وہ پاکی کو کیا سمجھ سکتا ہے۔ جن کو اللہ کی معرفت حاصل نہیں وہ اللہ کی معرفت کو کیسے پہچان سکتے ہیں، وہ تو اپنے اسی ذہن سے سوچیں گے جس میں محدود عقل اور محدود سوچ ہے۔

یہاں ایک اہم بات سمجھنی چاہیے کہ جن کو اللہ تعالیٰ نے یہ نور عطا فرمایا ہو جس کے ذریعہ ان کو ایسی باتیں محسوس ہوں تو ان کو چاہیے کہ وہ دوسرے لوگوں پہ رحم کریں اور ان کے سامنے وہ باتیں نہ کریں جو لوگوں کی سمجھ سے باہر ہوں۔ جیسے اس بزرگ نے اس آدمی کو مشورہ دیا کہ آپ مہربانی کر کے اپنے گھر میں یہ بات کریں۔ یہ ایک ادب کی بات ہے اس کا خیال رکھنا چاہیے۔

انہی لوگوں کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ جب ان کو اللہ کی اسم باطن والی معرفت حاصل ہو جاتی ہے تو ان کی زبان گنگ ہو جاتی ہے جو سمجھدار ہوتے ہیں وہ خاموش ہو جاتے ہیں، اس وقت ان کا بات کرنا خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔ کیونکہ لوگ اس کو سمجھیں گے نہیں لہذا خراب ہو جائیں گے اور مخالفت پہ اتر آئیں گے۔ بعض اوقات اس مخالفت سے گمراہی کا خطرہ بھی ہو سکتا ہے۔

خود میرے ساتھ ایک واقعہ ہوا ہے۔ ایک مرتبہ میں ماہ رمضان میں پشاور جا رہا تھا۔ میں باوضو تھا اور جیب میں قرآن پاک کا چھوٹا نسخہ بھی تھا تو میں نے سوچا کچھ

تلاوت کر لوں۔ میں نے قرآن پاک نکال کر تلاوت کرنا شروع کر دی۔ کنڈیکٹر نے مجھے تلاوت کرتے دیکھا تو ڈرائیور کو آواز دے کر کہا استاد جی میوزک بند کر دیں یہاں ایک صاحب تلاوت کر رہے ہیں۔ ڈرائیور نے ریکارڈنگ بند کر دی۔ میں بڑا خوش ہو گیا کہ اللہ کا شکر ہے سہولت ہو گئی۔ پندرہ سولہ کلومیٹر آگے گئے ہوں گے کہ کسی کا شیطان جاگ گیا۔ ایک آدمی اٹھ کر کہنے لگا کہ صرف یہ ہی تو سفر نہیں کر رہے ہم بھی سفر کر رہے ہیں ہم کہتے ہیں کہ میوزک چلاؤ۔ اس بات پہ ذرا بحث ہو گئی۔ خیر ڈرائیور نے دوبارہ میوزک چلا دیا۔ میں نے قرآن پاک بند کر کے جیب میں رکھ لیا اور اپنے ساتھ والے سے کہا کہ دیکھو میں بھی سواری ہونے کی حیثیت سے بحث کر سکتا ہوں اور میں حق پر بھی ہوں، لیکن اس وقت اس آدمی پر اتنی شیطانیت سوار ہے کہ مجھے خطرہ ہے کہ اس کی زبان سے کہیں کلمۂ کفر نہ نکل جائے کیونکہ اس کو احساس نہیں کہ میں کیا کر رہا ہوں کس چیز کو منع کر کے کس چیز کو کرنے پہ زور دے رہا ہوں۔ اگر قرآن پاک کے بارے میں یا دین کے بارے میں اس کے منہ سے کوئی توہین کا لفظ نکل گیا تو یہ کافر ہو جائے گا، میں اس کو کافر نہیں کرنا چاہتا۔ قرآن پاک کی تلاوت کرنا مستحب ہے لیکن اس کو کفر سے بچانا فرض ہے لہذا میں نے قرآن پاک رکھ دیا۔ حق پر ہوتے ہوئے بھی ہم اپنی بات سے اس لئے دست بردار ہوئے کہ ہمارے خیال میں ایسا ہی کرنا چاہیے تھا۔ اگر ہم ایسے نہ کرتے تو خواہ مخواہ ایک شخص کا ایمان خطرے میں پڑ جاتا۔ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ جواب بھی آتا ہے، طاقت بھی ہوتی ہے، حالات بھی ہوتے ہیں لیکن اس بات سے ڈرتے ہیں کہیں یہ دین سے نکل نہ جائے گمراہ نہ ہو جائے، بلاوجہ کی بد گمانی نہ ہو جائے اس وجہ سے خاموش رہتے ہیں۔

متن:

پس اہل ظاہر یہ کلام مجذوب کی جانب سے تصور کر کے اُس کو ضرر پہنچاتے ہیں۔ پس تم حتمی طور پر یہ بات سمجھ رکھو کہ تجلیاتِ ذات میں کوئی کلام نہیں، کلام صرف تجلی صفات میں ہے، اور محمد حسین بن نصیر الدین مصنف بحر المعانی نے اپنا حال ایک مرید کو ظاہر کیا، اور فرمایا کہ افراد کے گروہ میں بھی اونچے درجوں والے ہوتے ہیں۔ یہ فقیر مقامِ لاہوت یعنی مقامِ فردانیت میں جا پہنچا اور فردانیت کے تیسرے مقام میں

فروکش ہوا اور وہ یہ ہے کہ "قَالَ الْفَقِیْرُ إِذَا أَرَادَ اللّٰہُ أَنْ یُوَالِیَ عَبْدًا مِّنْ عِبَادِہٖ فَتَحَ عَلَیْہِ أَبْوَابَ الْقُرْبِ ثُمَّ أَجْلَسَ عَلٰی کُرْسِیِّ التَّوْحِیْدِ ثُمَّ یَرْفَعُ عَنْہُ الْحُجُبَ الْعَظِیْمَۃَ فَیُقَوِّیْہِ لِلْمُشَاھَدَۃِ ثُمَّ أَدْخَلَہٗ دَارَ الْفَرْدَانِیَّۃِ وَ کَشَفَ عَنْہُ الْجَمَالَ فَإِذَا وَقَعَ بَصَرُہٗ عَلَی الْجَمَالِ بَقِیَ "ھُوْ" فَحِیْنَئِذٍ صَارَ الْعَبْدُ فَانِیًا وَّبِالْحَقِّ بَاقِیًا"

ترجمہ: فقیر کہتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ ارادہ کرتا ہے کہ اپنے بندوں میں سے کسی کو دوست بنائے تو اس پر قرب کے دروازے کھول دیتا ہے۔ پھر اس کو توحید کی کرسی پر بٹھاتا ہے پھر اس کے سامنے سے بڑے بڑے پردے اٹھا دیتا ہے اور اس کو مشاہدہ کی قوت بخشتا ہے۔ پھر اس کو فردانیت کے مقام میں داخل کرتا ہے اور اس کو اپنا جمال دکھا دیتا ہے۔ جب اس کی نظر جمال پر پڑ جاتی ہے تو "**ھُو**" باقی رہ جاتا ہے اور بندہ فانی ہو جاتا ہے۔ اور "**حق**" باقی رہ جاتا ہے۔

اے میرے پیارے! **ھُو** کے دائرے سے تم عزت کے مقام تک پہنچو گے اور **ھُو** کے سوا تم سے کچھ ظاہر نہ ہو گا۔ اور دنیا کے حالات اور اشیاء میں سے عرش سے لے کر پاتال تک تم کو کچھ خبر نہ ہو گی۔ بعض لوگوں کو یہ مقام احمد کے نور سے اور بعض کو احد کے نور سے حاصل ہوتا ہے۔

تشریح:

یہ باریک باتیں ہیں ان میں کلام نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ مشاہدات ہیں۔ جن کو یہ مشاہدات ہوئے، وہی انہیں سمجھ سکتے ہیں اور جان سکتے ہیں۔ اللہ جل شانہ نے انسان کو اپنی خلافت کے لئے پیدا کیا ہے۔ خلیفہ پر ساری چیزوں کو کھولا جاتا ہے لیکن اسی پر جو اس کا اہل ہوتا ہے۔ اس لئے جن پر یہ چیزیں کھول دی جائیں انہیں ان سے انکار نہیں کرنا چاہیے اور جن پر نہ کھولی جائیں ان کو دعویٰ نہیں کرنا چاہیے۔ جن کو دیا جاتا ہے وہ بولتے نہیں اور جو بولتے ہیں ان کو ملا نہیں ہوتا۔ جو عارف ہوتا ہے وہ خاموش ہوتا ہے اور غیر عارفین جن کا نفس مرا نہیں ہوتا وہ اپنے نفس کی خاطر اپنی حد سے اوپر کی باتیں کرنا شروع کر دیتے ہیں جو صرف ہوائی باتیں ہوتی ہیں، وہ انہی میں مستغرق رہتے ہیں، موٹی موٹی باتیں کرتے ہیں اور عمل صفر ہوتا ہے۔ جبکہ وہ لوگ جن کو کچھ ملا ہوتا ہے ان کے ہاں باتوں کی بجائے عمل پہ زور ہوتا ہے۔ کبھی کبھی یہ لوگ اپنے

کسی راز دان سے یہ باتیں کر بھی لیتے ہیں، اس راز دان کے ذریعے یہ باتیں لوگوں تک پہنچ جاتی ہیں لیکن لوگوں میں سمجھنے والے کم ہوتے ہیں۔

بہر حال جن لوگوں کو یہ مشاہدات کرائے گئے ہوں ان پہ اعتراض نہیں کرنا چاہیے۔

متن:

باب سوم

حضرت صاحب شیخ رحمکار کی ریاضت اور مجاہدوں کے بیان میں۔

ہمارے شیخ محترم شیخ المشائخ (حضرت شیخ رحمکار) اپنے زمانے میں نہایت عبادت اور ریاضت فرماتے تھے۔ ریاضت کے جنگل کے ایک شیر تھے اور محنت کے سمندر کے نہنگ تھے۔ حضرت موصوف نے اپنے ایام طفولیت میں اتنی ریاضتیں، محنتیں اور مشقتیں اُٹھائی تھیں جو کہ شمار اور گنتی سے باہر ہیں۔ اپنی صغرِ سنی اور طفولیّت کے زمانے میں کچھ وقت ابتدائے حال میں بالکل باتیں نہیں کرتے تھے اور کھانا بھی نہیں کھاتے تھے۔ ان حالات میں ایک دن آپ کی والدہ محترمہ کو گھر کے اندر کسی چیز کی ضرورت پیش آئی، اُس کو تلاش کیا، مگر سخت جستجو کے باوجود وہ چیز نہ پا سکیں۔ حضرت صاحب وہ چیز دیکھتے تھے اور جانتے تھے کہ اُن کو اس چیز کی ضرورت ہے، لیکن اس وقت وہ کسی قسم کی گفتگو نہیں کرتے تھے، اور اللہ کا ذکر اور فکر کرنے کے علاوہ دوسرا کام نہیں کرتے تھے، اس لیے خود حضرت صاحب بنفسِ نفیس اُس چیز کی طلب کے لیے اُٹھے لیکن بھوک کی شدت کی وجہ سے سخت کمزور تھے، بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ والدہ صاحبہ نے مامتا کی وجہ سے چیخ ماری اور فریاد کرنے لگیں۔ ان کو خطرہ لاحق ہوا کہ جن بھوت نے ان کو یہ نقصان پہنچایا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد حضرت صاحب ہوش میں آئے اور اپنی مشفقہ والدہ مکرمہ سے کہا کہ میں صحیح اور تندرست ہوں۔ اس چیز کے لیے جس کو تم ڈھونڈتی تھی، میں اُٹھنا چاہتا تھا، مگر کمزوری کی وجہ سے میں زمین پر گر پڑا۔ اور اُن کو وہ چیز بتا دی اور دکھا دی۔ اور اکثر دفعہ لوگوں سے بھاگا کرتے تھے اور جب رات سر پر آ جاتی تو اُن کی والدہ محترمہ اُن کی تلاش کی خاطر گاؤں کے لوگوں کو بھیجا کرتیں۔ اور وہ ان کو ڈھونڈتے اور جب اُن کو پا لیتے تو گھر لے آتے، کیونکہ اُس زمانے میں چوروں ڈاکوؤں وغیرہ کا بہت زیادہ خطرہ تھا اور "حال" کے ابتدائی

ایام میں حضرت صاحب موسم سرما میں رات کے وقت پانی میں بیٹھ کر گزارا کرتے تھے، اور اس کے نتیجے میں برف کی تہہ اُن کی گردن کے گرد حلقہ بنائے ہوئے نظر آتی تھی۔ تہجد کے وقت وہ پہنے ہوئے کپڑے پانی سے نچوڑ لیتے تھے اور اُس کے بعد نماز تہجد ادا کرتے تھے۔ اپنی جوانی کے آغاز میں حضرت صاحب نے اپنی والدہ محترمہ اور اپنے بھائیوں کے ساتھ اس بات پر مصالحت کی، اور ان کو کھل کر کہا کہ اے والدہ مکرمہ اور اے میرے بھائیو! اگر مجھے اختیار کرنا چاہتے ہو، تو میں تمہارے ساتھ رہوں گا اور میں دنیا کو تصدّق کروں گا۔ اور اگر تم دنیا کو اختیار اور پسند کرنا چاہتے ہو تو میں تمہارے درمیان سے نکل جاؤں گا، اور تم اپنا معاش اور گذارہ کرتے رہو۔ پس اس قرارداد پر جانبین نے مصالحت کی اور انہوں نے اس کے جواب میں کہا کہ ہم نے تم کو اختیار کیا اور دنیا کے امور تم پر چھوڑ دیے، ہم نے دنیا تمہارے حوالے کی، اور آپ جو پسند فرماتے ہوں وہی کرو۔ حضرت صاحب نے ایک دن میں ستر دنبے اور تیس گائے بیل ذبح کر ڈالے۔ ایک اعلیٰ گھوڑا بھی حضرت صاحب کے ہاں تھا، حضرت صاحب اُس گھوڑے پر سوار ہو کر دور دراز کا سفر کرتے۔ ایک کھلے اور طویل میدان میں گھوڑے کو دوڑایا اور دور لے جا کر اُس کو تنہا اپنے ہاتھوں ذبح کر ڈالا اور کہا کہ میں نے گھوڑا درندوں اور دیگر گوشت خور جانوروں کی خاطر تواضع کے لیے ذبح کر ڈالا تم لوگ اس کام میں مداخلت نہ کرو۔ گھوڑے کا پیٹ چاک کر کے وہاں چھوڑ دیا۔ اور حضرت صاحب واپس اپنے مکان کو تشریف لے آئے۔

ے

جدا مست و جہد مایۂ اقبال آدمی
تا از حضیض بہ اوج سما رسد
مردانی ز جد و جہد بجائے رسیدہ اند
آن را کہ جد و جہد نہ باشند کجا رسد

"آدمی کے اقبال و ترقی کے لیے جد و جہد ایک سرمایۂ اقبال ہے۔ جد و جہد اور کوشش سے انسان فرشِ خاک سے اوجِ سما اور فرازِ عرش تک پہنچتا ہے۔ لوگ جد و

جہد اور کوشش سے اپنے مقام عالی تک پہنچ گئے ہیں۔ اور جو لوگ کوشش نہیں کرتے وہ کہاں پہنچتے ہیں"

"**شمائلِ اتقیاء**" نامی ایک کتاب میں لکھا ہے کہ ابدال ان چار عادات و فضائل کی وجہ سے ابدال ہو جاتے ہیں: "**قِلَّةُ الطَّعَامِ وَقِلَّةُ الْمَنَامِ وَقِلَّةُ الْكَلَامِ وَاحْتِمَالُ جَفَاءِ الْأَنَامِ**" یعنی تھوڑا کھانا، تھوڑا سونا، تھوڑا بولنا اور لوگوں کی جفاکاریوں کو برداشت کرنا۔ ابدال وہ ہوتے ہیں کہ ان کی برائیاں خوبیوں میں تبدیل ہو جائیں اور ایسا ہونا ریاضت کا ثمرہ ہوتا ہے۔

اور جس کسی کو ریاضت کرنے کی سعادت حاصل ہو جائے، تو اس کو ابدی نعمت اور سرمدی دولت نصیب ہو جاتی ہے۔ اور ہمارے حضرت شیخ اتنا کم سوتے تھے کہ جب دن کے وقت کبھی اتفاقاً قیلولہ کے طور پر سو جاتے تو چار یا پانچ گہرے سانس لینے کی مقدار میں سوئے ہوتے، پھر جاگ اُٹھتے اور آنکھ مبارک کھولتے۔ اور رات کی نیند کی حقیقت سے میں واقف نہیں ہوں، لیکن اندازہ کرتا ہوں اور خیال ہے کہ دن کی طرح اور اسی انداز پر نیند فرماتے۔ اور کھانے سے پیٹ بھرنا اور زیادہ کھانا بُرا سمجھتے تھے اور ایسا کرنے کو پسند نہیں فرماتے تھے۔

تشریح:

یہ سب باتیں ہمارے لئے نہیں ہیں، ایسا نہ ہو کہ ہم یہ سب کام شروع کر لیں۔ حضرت کا معاملہ اور تھا۔ بزرگ دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ جن کی تربیت مشائخ کرتے ہیں اور ایک وہ جن کی تربیت اویسی طریقہ پہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے۔ ایسے لوگوں کو مادر زاد ولی کہتے ہیں یعنی وہ ماں کے پیٹ سے ہی ولی پیدا ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے ان کے کام لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتے۔

حضرت بایزید بسطامی کو خواب میں اللہ تعالیٰ کا دیدار ہوا اور اللہ تعالیٰ سے پوچھا کہ اے اللہ تجھ تک پہنچنے کا آسان طریقہ کیا ہے تو اللہ پاک نے فرمایا:

"**دَعْ نَفْسَكَ وَتَعَالَ**"

"اپنے نفس کو چھوڑ اور میرے پاس آ جا"۔

نفس کو چھوڑنا یہی ہے کہ نفس جس چیز سے خوش ہوتا ہے اسے نہ کرنا، نفس کی

خواہش کے سامنے ہتھیار نہ ڈالنا اور اللہ تعالیٰ کے حکم کی طرف چلنا۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ عقلمند وہ ہے جس نے اپنے نفس کو قابو کیا اور آخرت کے لئے کام کیا اور بیوقوف وہ ہے جس نے اپنے نفس کو چھوڑ دیا کہ جو کرنا چاہے کرے اور پھر بغیر توبہ کئے اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی امیدیں کرتا رہا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نفس کو چھوڑنے میں اللہ تعالیٰ نے بہت کچھ رکھا ہے۔ انسان کے اندر بہت ساری صفات ہیں لیکن ان صفات پر نفس کی خواہشات کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ جیسے جیسے انسان نفس کی خواہشات کو کچلتا ہے ویسے ویسے اس کی صفات نکھرتی چلی جاتی ہیں اور وہ اپنے صحیح انسانی ارتقا کے راستے پر چلتا ہے۔ یہ چیز مجاہدہ کہلاتی ہے۔ مجاہدہ اور ذکر اذکار مل کر بہت موثر کام کرتے ہیں۔

اگر کسی غبارے میں ہائیڈروجن بھری جائے تو جتنی ہائیڈروجن زیادہ ہو گی اتنا غبارہ اوپر اڑے گا لیکن اگر اس غبارے میں وزن زیادہ ہو تو غبارہ کم اونچا جائے گا، اس کا وزن جتنا جتنا کم کرتے جائیں گے وہ اتنا اتنا اوپر جائے گا۔ جہاز کی مثال سے بھی ہم اس بات کو سمجھ سکتے ہیں۔ جہاز کی طاقت انجن پر منحصر ہے، انجن جتنا طاقتور ہو گا جہاز اتنا اوپر اڑ سکے گا لیکن اس کے ساتھ ساتھ وزن کو بھی دیکھا جائے گا، انجن طاقتور ہونے کے ساتھ ساتھ جہاز کا وزن جتنا کم ہو گا جہاز مزید اوپر اڑے گا اور وزن جتنا بڑھتا جائے گا جہاز اتنا نیچے اڑے گا۔ لہٰذا جہاز کو زیادہ بلندی پر تیزی سے اڑانے کے لئے دو طریقوں سے ڈیزائن کیا جاتا ہے۔ ایک تو انجن کی طاقت بڑھائی جاتی ہے اس کے ساتھ ساتھ جہاز کے وزن کو بھی کم کیا جاتا ہے۔ جہاز کے وزن کو کم کرنے کے لئے ایسی دھاتیں استعمال کرتے ہیں جو وزن میں ہلکی ہوں۔

ان مثالوں کو سامنے رکھ کر یہ سمجھیں کہ ذکر انسان کی روح کے لئے انجن کی طرح ہے جو اسے اوپر اٹھاتا ہے جبکہ نفس انسان کی روح کے لئے وزن کی طرح ہے جو اسے نیچے کی طرف کھینچتا ہے اور اس کی رفتار کم کرتا ہے۔ نفس اور اس کی خواہشات کا وزن جتنا کم ہوتا جائے گا اس کی پرواز کی صلاحیت اتنی ہی بڑھے گی اور جتنا جتنا اس کے ذکر کی قوت بڑھے گی اس کی پرواز کی قوت بڑھے گی۔

نقشبندی سلسلہ میں ابتداءً ذکر اور مراقبات کے ذریعے روحانی طاقت بڑھائی جاتی

ہے۔ اس کے بعد مجاہدہ کے ذریعے نفس کا ثقل کم کیا جاتا ہے۔ جبکہ باقی سلاسل میں پہلے نفس کا وزن کم کرایا جاتا ہے، نفس کے خلاف مجاہدات کرائے جاتے ہیں، اس کے بعد ان پہ جذب طاری ہوتا ہے اور اس کے ذریعے وہ آگے بڑھتے ہیں۔ بہر حال چاہے پہلے پرواز کی طاقت بڑھائیں یا پہلے وزن کم کریں۔ منزل ایک ہی ہے۔

بعض لوگوں نے جب ان چیزوں کو دیکھا تو انہوں نے اعتراض کرنا شروع کر دیا کہ یہ تو رہبانیت ہے اور اسلام میں رہبانیت نہیں ہے۔ لیکن وہ اس چیز کو بھول گئے کہ رہبانیت میں نفس کے خلاف اپنی خواہشات کو قربان کرنا دین کا حصہ سمجھا جاتا ہے اور اس کو ثواب کا کام سمجھا جاتا ہے جبکہ ہمارے ہاں اس کو ثواب نہیں سمجھا جاتا البتہ اس کی وجہ سے جو روحانی پرواز بڑھتی ہے اس کا اثر اعمال پر پڑتا ہے، اس سے نماز اچھی ہوتی ہے، روزہ اچھا ہوتا ہے اور ہر دینی کام اچھا ہوتا ہے اس سے اس کا اجر بڑھ جاتا ہے اور ثواب زیادہ ملتا ہے۔

مجاہدے میں خود وہ کام مقصود نہیں ہوتا جو بطور مجاہدہ کیا جاتا ہے بلکہ اس کے ذریعے نفس کی مخالفت مقصود ہوتی ہے۔ نفس کی وہ مخالفت جس کے لئے شرعی دلیل موجود ہو اس میں تو ثواب سمجھیں گے لیکن جس کے لئے شرعی دلیل موجود نہیں ہے اس میں ہم ثواب نہیں سمجھیں گے مثلاً روزہ میں نفس کی مخالفت ہے کہ ہم روزہ کی حالت میں صبح صادق سے لے کر غروب آفتاب تک نہ کچھ کھاتے ہیں اور نہ ہی پیتے ہیں اور مباشرت سے بچے رہتے ہیں، یہ مجاہدہ ہے لیکن یہ ایک ایسا مجاہدہ ہے جو شرعی دلیل سے ثابت ہے، لہٰذا اس مجاہدہ میں ثواب ہے۔ یہ ایک شرعی مجاہدہ ہے، اس میں ہمارا تصرف بالکل نہیں ہے، ہم نہ اس کو کم کر سکتے ہیں نہ زیادہ کر سکتے ہیں۔ اگر روزہ کچھ دیر پہلے شروع کر لیا تو ثواب میں کمی ہو جائے گی یا مقررہ وقت سے کچھ دیر بعد افطار کیا تب بھی ثواب میں کمی ہو جائے گی حالانکہ نفس کی مخالفت تو پھر بھی ہو رہی ہے لیکن اس کے باوجود ثواب میں اس لئے کمی ہو جائے گی کہ ہم نے اس میں کچھ کمی یا زیادتی کر لی ہے جو شریعت میں نہیں بتائی گئی تھی۔ شرعی مجاہدہ جتنا بتایا گیا ہوتا ہے ہم اتنا ہی کر سکتے ہیں، اس سے زیادہ نہیں کر سکتے، اس کی ایک حد ہوتی ہے ہم اس حد کو عبور نہیں کر سکتے۔

اختیاری مجاہدہ میں بطور مجاہدہ کیے جانے والے عمل میں ہم ثواب نہیں سمجھتے لیکن اس اختیاری مجاہدے کی وجہ سے جو ہمارا شرعی مجاہدہ بہتر ہوتا ہے اس میں ثواب ضرور ملتا ہے۔

مثلاً: اگر میری آنکھیں صحیح ہیں تو میں نظر کی عینک نہیں پہنوں گا، ایسا کرنا بے وقوفی ہو گی لیکن اگر میری آنکھ صحیح نہ ہو اور عینک کے ساتھ مجھے صحیح دکھتا ہو تو ایسی صورت میں عینک پہننی پڑے گی اور اس سے میرے سارے کام ٹھیک ہوں گے کیونکہ درست نظر آئے گا۔ اسی طرح اگر میرا روزہ، نماز، حج اور دوسرے شرعی اعمال پہلے ہی درست ہیں تو پھر مجھے کسی اضافی مجاہدے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ انہی شرعی مجاہدات نماز، روزہ، حج اور زکوۃ وغیرہ سے ہی میرا مجاہدہ ہو گا، مجھے اجر بھی ملتا رہے گا اور میرے باقی کام بھی درست ہوتے رہیں گے۔ جیسا کہ قرآن پاک میں فرمایا گیا ہے کہ نماز بے حیائی اور منکرات سے روکنے والی ہے۔ روزہ کے لئے فرمایا گیا کہ اس سے تقویٰ حاصل ہوتا ہے۔ زکوۃ بخل کا علاج ہے اور حج عشق کو حاصل کرنے کا طریقہ ہے۔ اگر یہ سب اعمال میں پہلے ہی کر رہا ہوں پھر تو مجھے کسی اضافی مجاہدہ کی ضرورت نہیں ہے لیکن اگر میں دیکھ رہا ہوں کہ حج کے ذریعہ اللہ پاک کے ساتھ میرے عشق میں اضافہ نہیں ہوتا، نماز سے میری منکرات نہیں چھوٹتیں، بے حیائی نہیں چھوٹتی، تو اس کا مطلب ہے کہ میرے ان اعمال میں کچھ کمی ہے اور اس کمی کو دور کرنے کے لئے کچھ اضافی محنت کرنے کی ضرورت ہے۔ ایک دفعہ دیکھا گیا کہ ایک مسجد میں امام صاحب نے جلدی جلدی نماز پڑھائی اور نماز پڑھانے کے فوراً بعد تیزی سے کمرے میں چلے گئے۔ لوگ حیران ہو گئے کہ امام صاحب کو کیا جلدی تھی۔ ان کا کوئی ساتھی ملنے کے لئے پہنچا تو دیکھا کہ امام صاحب ٹی وی پہ کرکٹ میچ دیکھ رہے تھے۔

اب بتائیں کہ اگر اس نے نماز جلدی جلدی اس لئے پڑھائی کہ میچ دیکھے تو اس کی نماز منکرات کو روکنے والی کیسے ہو گی بلکہ وہ تو نماز کے دوران منکرات کا ہی سوچ رہا تھا اور انتظار کر رہا تھا کہ کب نماز ختم ہو اور کب میں یہ منکر سر انجام دوں۔ نماز اسے منکر سے کیا روکتی، وہ نماز میں ہی اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اب مجھے بتاؤ کیا یہ نماز اس کو وہ چیز دے رہی ہے جو نماز کی خاصیت ہے؟ بالکل نہیں دے رہی۔ لہٰذا اس

کی اصلاح ضروری ہے۔ وہ اصلاح مجاہدے کے ذریعے ہو گی۔ اس کا طریقہ یہ ہو گا کہ اس پر نماز سے زیادہ مجاہدہ ڈالا جائے۔ اس کی مثال ایسے ہے جیسے کاغذ کو رول کر کے کھولیں تو یہ سیدھا نہیں ہو گا لیکن اگر اس کو مخالف سمت پر دوبارہ رول کر کے کھولیں تو سیدھا ہو جائے گا۔ دوبارہ کاغذ کو رول کرنے سے مقصود کاغذ سیدھا کرنا تھا محض رول کرنا مقصود نہیں تھا۔ کیونکہ یہ کاغذ اتنا مڑ چکا تھا کہ معمولی طور پر الٹا سیدھا کرنے سے سیدھا نہیں ہو رہا اس لئے مجبوراً اس کو مخالف سمت میں پورا رول کیا تاکہ یہ سیدھا ہو جائے۔ اسی طرح اختیاری مجاہدہ نفس کو سیدھا کرنے کے لئے ہوتا ہے کیونکہ نفس اتنا بگڑ چکا ہوتا ہے کہ اس کے بغیر وہ سیدھا نہیں ہو پا رہا ہوتا۔

حضرت سید سلیمان ندوی کا نواسا جو تب بالکل چھوٹی عمر کا نا سمجھ بچہ تھا، ایک مرتبہ کھیل کھیل میں حضرت کی ٹوپی اتار کے انہیں اس طرح مارنے کا اشارہ کرنے لگا جیسے چابک مارا جاتا ہے اور ساتھ ساتھ اپنی توتلی زبان میں یہ کہنے لگا کہ ہلنا مت ورنہ تمھیں سیدھا کر دوں گا۔ حضرت نے بجائے خفا ہونے کے فرمایا: "بیٹا اگر یہ کام ہو جائے پھر تو کیا ہی بات ہے، یہی تو مسئلہ ہے کہ میں سیدھا نہیں ہو رہا اگر مجھے سیدھا کر سکو تو اور کیا چاہیے"۔ حضرت نے تو یہ بات بچے سے پیار میں کہہ دی لیکن اس کے پیچھے ایک درد چھپا ہوا تھا اور وہ درد اپنی اصلاح کی فکر کا تھا۔

حضرت مجدد الف ثانی فرماتے ہیں کہ فنائے نفس بغیر مجاہدے کے حاصل نہیں ہوتا۔ نفس کو مارنے کے لئے مجاہدہ کرنا پڑے گا۔ یہ اختیاری مجاہدات اصل میں مجبوری ہیں، بالکل ایسے ہی جیسے انسان ہسپتال میں مجبوراً داخل ہوتا ہے، اور مجبوراً پرہیزی کھانے کھاتا ہے۔ یہ اس کی مجبوری ہے، اگر علاج نہیں کرے گا تو ٹھیک نہیں ہو گا۔ اسی طرح اگر ہم مجاہدات نہیں کریں گے تو روحانی طور پر بیمار رہیں گے۔

رہبانیت اور ان مجاہدات میں یہی فرق ہے کہ رہبانیت میں مجاہدہ مقصود ہوتا ہے جبکہ مجاہدات میں مجاہدہ کے ذریعے نفس کی اصلاح مقصود ہوتی ہے۔ لوگ اس فرق کو نہیں جانتے اور مجاہدات و ریاضات پر رہبانیت کا حکم لگا کر صحیح صوفیوں کے خلاف باتیں کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

حضرت کاکا صاحب کی منجانب اللہ تربیت ہو رہی تھی۔ ان کا رجحان شروع

سے ہی اس طرف تھا۔ وہ یہ سب کام خود بخود کر رہے تھے جو لوگوں سے بطور مجاہدہ کروائے جاتے ہیں۔ یہ چار مجاہدات ہیں جن سے ابدال بنتے ہیں۔ قلتِ بعام، قلتِ منام، قلتِ کلام، قلتِ خلط مع الانام۔

متن:

اور کھانے سے پیٹ بھرنا اور زیادہ کھانا بُرا سمجھتے تھے اور ایسا کرنے کو پسند نہیں فرماتے تھے، کیونکہ بزرگوں نے کہا ہے کہ جب سورج غروب ہوتا ہے تو رات چھا جاتی ہے۔ جب پیٹ بھر جاتا ہے تو باطن پر رات چھا جاتی ہے، یعنی باطن کو تاریک بناتی ہے۔ لیکن ایک وقت ان وقتوں میں ایسا آیا تھا کہ سارے مہینے میں جو کہ تیس (30) راتیں ہوتی ہیں، پختہ سیر کے وزن سے تیس (30) سیر وزن کا گھی کھانے میں نوش فرماتے۔

مطلب یہ کہ ہر رات ایک سیر گھی بعام کے ساتھ کھاتے۔ اُس حال میں تمام ماہ ایک ہی وضو سے عشاء و فجر کی نماز ادا کرتے۔

تشریح:

ایک مرتبہ ماہ رمضان میں ہم اعتکاف میں بیٹھے تھے کہ ایک صاحب ہم سے ملنے آئے اور دوران گفتگو رو پڑے۔ کہنے لگے کہ "شاہ صاحب میں نے سارا نقشبندی سلوک طے کر لیا ہے لیکن حال یہ ہے کہ میں نے اس ماہ اپنے گھر میں کیبل لگوائی ہے اور میں اس پہ بہت پریشان ہوں، میری اصلاح نہیں ہو پا رہی، سارا سلوک طے کر لیا ہے اب اس کے علاوہ اور کیا کروں کہ میری اصلاح ہو جائے"۔

ان کی بات سن کر میں بھی ڈر گیا اور سوچ میں پڑ گیا کہ ان کو کیا جواب دوں اور ایسا کیا بتاؤں جس سے ان کی اصلاح ہو جائے۔ میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ یا اللہ ان کے لئے کوئی جواب بھیج دے۔ الحمد للہ! اللہ نے دعا قبول فرمائی اور میرے دل میں ایک بات آ گئی۔ میں نے ان سے کہا کہ "بھائی صاحب آپ نے دل کا سلوک طے کیا ہے، نفس کا سلوک طے نہیں کیا۔ آپ نے ذکر و اذکار کر کے دل کو تو بنا لیا، یہی وجہ ہے کہ آپ رو رہے ہیں، آپ کو دلی طور پہ احساس ہے کہ آپ نے غلط کیا ہے ورنہ آپ نہ روتے۔ یہ احساس اسی لئے ہے کہ آپ کے دل کی اصلاح ہوئی ہے لیکن اس کے با وجود آپ سے گناہ ہوا، اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کے نفس کی اصلاح ابھی

نہیں ہوئی۔ چونکہ ابھی آپ نے نفس کا علاج اور مجاہدہ نہیں کیا اس لئے آپ کو نفس کے اوپر قابو نہیں ہے۔ اگر آپ نفس کے اوپر قابو حاصل کرنے کے لئے تیار ہیں تو ہمارے پاس کچھ وقت لگائیں"۔

اس وقت وہ چلے گئے پھر عید کے بعد تشریف لائے اور اپنی اصلاح کروانا شروع کی اور اللہ کے فضل سے ان کے معاملات بہتر ہونا شروع ہو گئے۔

ڈاکٹر ارشد صاحب ہمارے ساتھی ہیں اور چاروں سلسلوں کے شیخ ہیں۔ ان کے ساتھ بات چیت کے دوران میں نے یہ ساری گفتگو انہیں سنائی جو میرے اور اس آدمی کے درمیان ہوئی تھی۔ جب انہوں نے وہ جواب سنا جو میں نے اس شخص کو دیا تھا کہ "آپ کی دل کی اصلاح ہوئی ہے لیکن نفس کی اصلاح نہیں ہوئی" تو ڈاکٹر ارشد صاحب نے فرمایا کہ "شاہ صاحب آپ نے تو ہمارا مسئلہ ہی حل کر دیا۔ ہم دو بھائی ہیں اور دونوں ہی شیخ ہیں۔ ہم کچھ دنوں سے اسی بات پہ غور و فکر اور بات چیت کر رہے ہیں کہ آخر کیا وجہ ہے کہ آج کل لوگوں کی اصلاح نہیں ہو پاتی۔ ہمارے پاس لوگ اصلاح کروانے آتے ہیں، ہم انہیں مختلف معمولات اور اذکار و اوراد بتاتے ہیں اور وہ ان پر عمل بھی کرتے ہیں اس کے باوجود ان کی اصلاح نہیں ہوتی۔ ہم مسلسل اسی بات پہ غور و فکر کر رہے تھے لیکن ہمیں کوئی جواب سمجھ نہیں آ رہا تھا، آپ نے تو مسئلہ ہی حل کر دیا ہے۔ اب ہمیں اپنے سوال کا جواب مل گیا ہے کہ لوگوں کی اصلاح اس لئے نہیں ہوتی کہ وہ نفس کو ٹھیک کرنے کے لئے مجاہدات نہیں کرتے، معمولات اور اذکار و مراقبات سے دل کی اصلاح تو ہوتی ہے لیکن نفس کی اصلاح مجاہدات کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ یہ بات تو ہمیں سمجھ آ گئی ہے لیکن اب ہمارا ایک سوال ہے کہ آپ لوگوں سے نفس کی اصلاح کے لئے مجاہدات کیسے کروائیں گے؟ کیونکہ مجاہدات چار انواع کے ہوتے ہیں۔ قلت بعام، قلت منام، قلت کلام اور قلت خلط مع الانام۔ آج کل پہلے دونوں مجاہدے متروک ہیں، مشائخ حضرات اب سالکین سے یہ مجاہدے نہیں کرواتے کیونکہ لوگوں میں اتنی قوت نہیں ہے کہ یہ مجاہدے برداشت کر سکیں۔ ایسے حالات میں ہم لوگوں سے کس طریقے سے مجاہدات کروائیں تاکہ ان کے نفس کی اصلاح ہو سکے"۔

میں نے ڈاکٹر صاحب کو اس کا یہ جواب دیا کہ آج کل سالکین سے یہ مجاہدات

کروانے کا طریقہ یہ ہے کہ کبھی کریں اور کبھی نہ کریں۔ مثلاً ایک ہفتہ قلت بعام اور قلت منام کا مجاہدہ کریں اس سے اگلا ہفتہ نہ کریں۔ اس طرح مجاہدہ بھی باقی رہے گا اور درمیان میں وقفہ ہونے کی وجہ سے برداشت بھی ختم نہیں ہو گی۔ جب انسان مسلسل مجاہدہ کرتا ہے تو وہ اس کے لئے مجاہدہ نہیں رہتا کیونکہ کچھ وقت کے بعد انسان اس کام کا عادی ہو جاتا ہے۔ اگر یہ طریقہ اختیار کریں گے جو میں نے عرض کیا کہ ایک ہفتہ مجاہدہ کرے اور ایک ہفتہ چھوڑ دے۔ اگر دوسرے ہفتے چھوڑ دے گا تو عادی نہیں ہو گا اور برداشت سے باہر بھی نہیں ہو گا۔ پھر اگلے ہفتے دوبارہ کرے گا تو مجاہدہ بھی لگے گا۔ مجاہدہ ہو گا تو نفس کی مخالفت ہو گی، نفس کی مخالفت ہو گی تو نفس کی اصلاح ہونا شروع ہو جائے گی"۔

یہ بات سن کر ڈاکٹر ارشد صاحب نے فوراً کہا کہ یہ تو حضرت کاکا صاحب کا مجاہدہ ہے۔

یہی بات ابھی ہم نے اوپر متن کی عبارت میں پڑھی کہ حضرت کاکا صاحب کس طرز کا مجاہدہ کیا کرتے تھے۔ ایک ماہ سخت مجاہدہ کرتے تھے اس کے بعد اگلے ماہ خوب کھاتے پیتے تھے یہاں تک کہ روزانہ ایک سیر خالص دیسی گھی پیتے تھے اس کے بعد پھر اگلے ماہ خوب مجاہدہ کرتے تھے۔

کھانے پینے اور آرام و آسائش کا مقصد نفس کو پالنا نہیں بلکہ نفس کو تیار رکھنا ہے۔ ایک نفس وہ ہوتا ہے جو پل پل کر اتنا موٹا ہو چکا ہوتا ہے کہ ہمارے قابو سے ہی باہر ہو جاتا ہے اور اپنی خواہشات پوری کرنے کے لئے ہمیں اپنے پیچھے لگائے رکھتا ہے۔ دوسرا نفس وہ ہے جو ہمارے قابو میں ہوتا ہے لیکن اس میں اتنی طاقت اور جفاکشی ضرور ہوتی ہے کہ ہمارے کہنے کے مطابق بلکہ اللہ و رسول کے کہنے کے مطابق اعمال کر سکے۔ نفس کو ایسا بنانے کے لئے محنت تو کرنی پڑے گی اسی محنت کو ہی مجاہدہ کہتے ہیں۔

ہمارا یہ موقف تو پہلے سے ہی تھا کہ نفس کے مجاہدات کے بغیر کام نہیں بنتا۔ الحمد للہ اس واقعہ سے مزید شرح صدر ہو گیا۔ اس کے بعد ہم نے اس پر لکھنا شروع کیا کہ آج کل کے دور میں مجاہدہ پھر سے شروع کرنا چاہیے اس کے بغیر کام نہیں ہو گا۔ یہ جو ہم نے مجاہدہ مکمل طور پر متروک مان لیا ہے اس کی وجہ سے بہت خرابیاں پیدا ہو

گئی ہیں اور ہمارا نفس قابو سے باہر ہوتا جا رہا ہے، اس کو قابو میں لانے کے لئے اس کو مجاہدے کی نکیل ڈالنی پڑے گی۔ ذکر و اذکار سے دل تو زندہ ہو جاتا ہے لیکن نفس قابو میں نہیں آتا جبکہ ذکر کے بغیر صرف مجاہدہ کرنے سے نفس تو قابو میں آ جائے گا لیکن اس کی سمت درست نہیں رہے گی۔ جوگی بھی نفس کا خوب مجاہدہ کرتا ہے لیکن ذکر نہیں کرتا، اس کے دل میں ایمان بھی نہیں ہوتا جس کے نتیجہ میں اس کا سارا مجاہدہ دنیا کے لئے ہو جاتا ہے۔ آپ ذرا تحقیق کریں تو یہ دیکھ کر حیران ہو جائیں گے کہ ہندوؤں میں جوگی اور سوامی قسم کے لوگ بے حد مجاہدے کرتے ہیں، کئی کئی دن ایک ہاتھ اٹھا کر بے حس و حرکت اور ساکت و صامت بیٹھے رہتے ہیں۔ لیکن آپ بتائیں کہ انہیں ان ساری ریاضتوں اور مجاہدوں کا دنیا کی شہرت کے علاوہ کیا فائدہ ملتا ہے؟

جو لڑکے موٹر سائیکل پر ویلنگ کرتے ہیں آپ نے دیکھا ہو گا کہ وہ اس کے لئے کتنی محنت کرتے ہیں اور کتنا خطرہ اٹھاتے ہیں۔ انہیں لگتا ہے کہ لوگ سمجھیں گے کہ ہم بڑے بہادر ہیں کہ جان تک کی پروا نہیں کرتے۔ حالانکہ لوگ ان کو پرلے درجے کا بیوقوف سمجھتے ہیں لیکن انہیں کوئی ہوش نہیں ہوتا وہ اپنے کام میں مگن ہوتے ہیں۔

جن کا دل زندہ نہیں ہے جب وہ مجاہدہ کریں گے تو ان کا سارا مجاہدہ دنیا کی نذر ہو جائے گا اور جو صرف ذکر کے ذریعے دل کو تو زندہ کر لیں گے لیکن مجاہدہ نہیں کریں گے انہیں راستہ تو معلوم ہو گا مگر وہ اس پہ چل نہیں سکیں گے۔ مکمل اصلاح کی خاطر دونوں کام ضروری ہیں۔ مجاہدہ بھی کرنا ہے اور ذکر بھی کرنا ہے۔ ان دونوں کاموں کی ایک بڑی شرط یہ ہے کہ یہ دونوں کام شیخ کامل کی نگرانی میں کرنے ہیں، شیخ کی نگرانی کے بغیر ان کا صحیح فائدہ نہیں ہو گا۔ کنٹرول ہر جگہ ضروری ہوتا ہے۔ ایٹمی توانائی تباہی ہے لیکن اگر اس کو ایٹمی ری ایکٹر کے ساتھ قابو کر لیں تو فائدہ مند ہے۔ سیلاب تباہی ہے لیکن اس کے آگے بند باندھ لیں تو انرجی کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ اسی طرح ذکر اور مجاہدہ بڑے کام کی چیزیں ہیں، لیکن انہیں بے ترتیبی اور بغیر نگرانی کے کرنا فائدہ کی بجائے نقصان کا باعث بن سکتا ہے۔ انہیں کنٹرول کرنے کے لئے کسی کی نگرانی میں کام کرنا ضروری ہے اور نگرانی شیخ کرے گا۔ بغیر نگرانی کے ذکر کرنے سے بھی مسئلہ پیدا ہو سکتا ہے اور بغیر نگرانی کے مجاہدہ کرنا بھی خطرے سے خالی نہیں ہے۔

متن:

اور رات بھر نوافل پڑھتے رہتے۔ اُس مہینے کے گذرنے کے بعد جیسا کہ ذکر گذر چکا، حضرت صاحب اس معمول کا ذکر فرماتے، اور اس کی تعریف فرماتے کہ اس ماہ کا بہت اچھا معمول تھا جو کہ گذر چکا۔ اور اوائل میں حضرت صاحب کے معمول کے بارے میں نقل کرتے ہیں کہ اٹھارہ مہینے بعام نہیں کھاتے تھے، اور ایک ماہ پانی نہیں پیتے تھے، لیکن آخری عمر میں دو ماہ بہت دفعہ بعام نہیں کھاتے تھے اور ایک سال پانی نہیں پیتے تھے۔ اور حضرت صاحب کے کھانا کھانے کا اندازہ یہ تھا کہ کبھی کبھی بہت سا عرصہ جَو کی روٹی کھایا کرتے، اور کبھی کبھی بہت عرصے تک ارزن شموخہ (ایک گھاس ہے) کی روٹی کھاتے تھے۔ اور کبھی کبھی بہت عرصے تک دوسرا غلہ کھاتے تھے۔ اور بغیر نمک والے سالن کی کم خوراک تناول فرماتے۔ اور پتلی روٹی جو اچھی طرح پک کر سخت ہو گئی ہو، کھاتے تھے کہ اس روٹی میں مغز نہیں ہوتا تھا۔ اور لذیذ کھانا نہیں کھاتے تھے مگر دوسروں کے التماس اور لحاظ سے کہ کسی نے اس کو نہ دیکھا ہو، کھایا کرتے، مگر سیر ہو کر نہ کھاتے۔ اور امیروں میں سے ایک امیر ان کی خدمت میں حاضر ہوا، بازار کی شیرینی میں سے حضرت صاحب کے کھانے کے لیے کچھ شیرینی لے آیا۔ اور عرض اور استدعا کی کہ حضرت! یہ شیرینی جو میں خدمتِ اقدس میں لا چکا ہوں، آپ میرے روبرو اس میں سے تناول فرمائیے۔ حضرت صاحب نے ان کی خاطر وہ شیرینی منہ میں ڈالی اور پھر پھینک دی۔ چنانچہ حضرت شیخ صاحب نے فرمایا کہ اس شیرینی کی مٹھاس میرے حلق سے نہیں گزری۔ میں اپنی زبان کپڑے سے رگڑتا اور وہ شیرینی پھینک دیتا تاکہ اُس کی مٹھاس اور لذت میرے منہ سے نکل جائے۔ اپنی زبان کو اتنا رگڑ دیا تھا کہ بہت عرصے کے لیے اس رگڑنے سے سخت تکلیف سے دو چار ہوئے اور وہ امیر اس راز سے آگاہ نہ ہوا۔ اُس وقت شام کے بعد کی خفتن کے قریب کی تاریکی چھا رہی تھی۔ اور یہ کام اُنہوں نے اس لیے کیا تھا کہ بازار کی اور لذیذ خوراک کھانے سے پرہیز فرماتے تھے اور جس بعام اور شیرینی پر لوگوں کی نظر پڑ چکی ہوتی، وہ تناول نہ فرماتے۔ اور یہ سچے اور حقانی صوفیائے کرام کے خصائل و خواص میں سے ہے کہ وہ بازار کا کھانا نہیں کھاتے اور نہ لذیذ قسم کے بعام کی طرف میل رکھتے ہیں۔ کیونکہ ان

کا نفس نفسِ مطمئنہ کے اوصاف سے متصف تھا اور ﴿يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ﴾ (الفجر: 27) کی ندائے دل نواز سے مخاطب ہو کر اس نام سے موصوف ہو گئے تھے۔

ے

لَيْسَ لِلْحَاجَاتِ إِلَّا مَن لَّهُ جَهْدٌ

فَعَلَيْكَ الْجَهْدُ فِيهَا وَ عَلَى اللهِ نَجَاحٌ

"جو لوگ جد و جہد اور کوشش کرتے ہیں، ان کی حاجت بر آتی ہے، تم کو چاہیے کہ تم کوشش کیے جاؤ اللہ تعالیٰ اس کی مکافات میں تمہاری حاجت بر لائے گا"

تشریح:

قرآن پاک کی ایک آیت ہے:

﴿وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾ (العنکبوت: 69)

ترجمہ: "اور جن لوگوں نے ہماری خاطر کوشش کی ہے، ہم انھیں ضرور بالضرور اپنے راستوں پر پہنچائیں گے"۔

اگر نفس اس حد تک بگڑا ہوا ہو کہ بغیر اضافی مجاہدہ کے قابو میں نہ آتا ہو تو اس کو قابو میں لانے کے لئے یہ مجاہدہ ضروری ہو جائے گا۔ تندرستی ہماری ضرورت ہے، اس تندرستی کے لئے پرہیز اور ڈاکٹر سے علاج کروانا بھی ضروری ہے۔ اسی طرح نفس کی اصلاح ضروری ہے تو اس کے لئے مجاہدات و ریاضات بھی ضروری ہوں گے۔ چاہے انسان کو سمجھ آئے یا نہ آئے صحت تو انہی کے ذریعے ہی حاصل ہو گی۔ مجاہدہ میں بعض اوقات جائز چیز کو بھی کچھ وقت چھوڑنا پڑتا ہے، جیسے کسی کو ٹائیفائیڈ ہو تو کھانا منع کر دیا جاتا ہے، حالانکہ کھانا جائز ہوتا ہے لیکن مجبوری کے طور پر اور علاج کے لئے کھانا منع ہوتا ہے اسی طرح مجاہدہ میں مجبوری کے طور پر اور روحانی علاج کی خاطر کچھ عرصہ کے لئے کچھ چیزیں منع کی جاتی ہیں کیونکہ بغیر پرہیز کے علاج نہیں ہوتا۔

ایک بچی بیمار تھی، ڈاکٹر نے اسے انڈہ منع کیا ہوا تھا۔ وہ بچی روتی رہی، ماں سے انڈا مانگتی رہی لیکن ماں نے نہیں دیا کیونکہ اس کی صحت کے لئے ٹھیک نہیں تھا۔ اخیر میں بچی نے اپنی معصومیت میں کہا کہ اچھا آپ انڈا پکا کر میرے سامنے رکھ دیں میں

کھاؤں گی نہیں صرف اس کو دیکھوں گی۔ والدین تو آخر والدین ہوتے ہیں، ان کا دل پسیج گیا، انہوں نے انڈا پکا کر اس کے سامنے رکھ دیا اور اپنی باتوں میں لگ گئے۔ بچی با قاعدہ دونوں کو دیکھتی رہی، جیسے ہی دونوں کسی وقت غافل ہوئے تو ایک جھپٹا مارا اور انڈا سیدھا منہ میں ڈال لیا، والدین دیکھتے ہی رہ گئے۔

نفس بھی اسی طریقے سے کام کرتا ہے۔ لہٰذا اسے قابو کرنے اور اس کی اصلاح کرنے کی بے حد ضرورت ہے۔ اسی اصلاح کے لئے مجاہدے کروائے جاتے ہیں۔

لوگوں نے رہبانیت والی حدیث شریف تو یاد کی ہوتی ہے لیکن اس کا صحیح منشا انہیں معلوم نہیں ہوتا۔ بلاشبہ یہ حدیث ہے کہ اسلام میں رہبانیت نہیں ہے۔ لیکن اس کا مطلب وہ نہیں جو لوگ سمجھتے ہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنے لئے کوئی ایسا مجاہدہ تجویز نہیں کر سکتے جس کی شریعت نے اجازت نہ دی ہو۔ مثلاً روزے کا ثواب بہت زیادہ ہے لیکن عید کے دن روزہ رکھنا حرام ہے، عید الفطر کے ایک اور عید الاضحی کے تینوں دنوں میں روزہ رکھنا حرام ہے، اگر کوئی ان دنوں میں روزہ رکھے گا تو گناہ گار ہو گا۔ جس مجاہدے کی شریعت نے حدود مقرر کی ہوں اس میں ہم ان حدود سے تجاوز نہیں کر سکتے۔

دوسری بات یہ ہے کہ مجاہدہ کے طور پر جو عمل کر رہے ہوں اس میں ثواب نہیں سمجھنا چاہیے۔ اگر ہم اسے ثواب کا کام سمجھیں گے تو وہ بدعت بن جائے گی۔ بدعت کی تعریف یہی ہے کہ کسی کام کو دین سمجھ کر کرنا اور اسے ثواب کا باعث سمجھنا۔ اگر ہم کوئی کام کریں لیکن اس میں ثواب نہ سمجھیں تو پھر وہ کام لغو تو ہو سکتا ہے مگر بدعت نہیں ہو گا کیونکہ بدعت دین میں اپنی طرف سے اضافہ کرنے کا نام ہے۔ ہر نئی چیز کو بدعت نہیں کہتے بلکہ وہ نئی چیز جو دین سمجھی جائے اور اس میں ثواب سمجھا جائے تب اسے بدعت کہیں گے۔ دین میں کئے جانے والے نئے کاموں کی دو قسمیں ہیں: ایک احداث للدین (دین کے لئے تبدیلی کرنا) اور ایک احداث فی الدین (دین میں تبدیلی کرنا)۔ دین میں تبدیلی کرنا تو منع ہے اور بدعت ہے جبکہ دین کے لئے تبدیلی کرنا منع نہیں ہے بلکہ مستحسن ہے۔ دین کے لئے تبدیلی کرنے کی ایک بڑی مثال ہر مسجد کے ساتھ مینار کا ہونا ہے۔ دورِ نبوی اور قرون اولیٰ میں کہیں ثابت نہیں ہے کہ مساجد

کے مینار ہوا کرتے تھے لیکن آج کوئی بھی مسجد مینار کے بغیر نہیں ہوتی یہاں تک کہ حریمین شریفین کی مساجد میں بھی مینار ہیں۔ اور یہ بدعت نہیں ہے کیونکہ مینار کا اضافہ دین کے لئے کیا گیا ہے، دینی اعمال میں مدد کی خاطر کیا گیا ہے۔ آبادی والے علاقوں میں اگر مینار نہ ہو تو مسجد کا علم صرف عمارت کو دیکھ کر نہیں ہو سکتا، ایسے میں اگر جماعت کا وقت کم ہو اور آدمی پوچھ پوچھ کر مسجد جائے تو ممکن ہے اس کی جماعت رہ جائے، لیکن مینار سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ دور سے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ مسجد ہے اور آدمی سیدھا مسجد پہنچ کر جماعت میں شریک ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اگر کوئی آدمی لوگوں سے مسجد کا راستہ پوچھے تو جو اسے مسجد کا راستہ بتائے گا اسے ثواب ملے گا، اسی طرح ایک آدمی نے مسجد کا مینار بنا دیا تاکہ مسجد آنے والے کو دور سے ہی معلوم ہو جائے تو اس کو بھی ثواب ملے گا کیونکہ اس کا مقصد مینار برائے مینار نہیں ہے بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کو مسجد کا پتا چل جائے۔ صرف مینار بنانے میں کوئی ثواب نہیں لیکن اگر کوئی مسجد کی نشاندہی کی خاطر مینار بنائے گا تو ضرور ثواب ہو گا۔

یہ بڑے باریک معاملات ہوتے ہیں۔ اس لئے ایسے معاملات میں جلدی نہیں کرنی چاہیے۔ یہ کوئی ہلکی پھلکی بات نہیں ہوتی، اس میں تفصیلات دیکھنی ہوتی ہیں۔

ہمارے جتنے بھی علماء ہیں یہ سب درس نظامی سے فارغ ہیں۔ کیا کبھی کسی صحابی نے درس نظامی کیا تھا؟ ظاہر ہے کسی صحابی نے درس نظامی نہیں کیا تو کیا خیال ہے سب درس نظامی کرنے والوں کو بدعتی قرار دیا جائے؟ ہر گز نہیں۔ کسی چیز کے بدعت ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ صرف اتنی بات سے نہیں کر سکتے۔ اس کے لئے ہمیں مزید گہرائی میں جا کر دیکھنا پڑتا ہے۔ درس نظامی والے مسئلے میں مزید گہرائی میں جا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ در اصل علم حاصل کرنا فرض ہے۔ اب ہر دور میں حصول علم کے ذرائع مختلف ہو سکتے ہیں، جس دور میں جو ذریعہ ہو گا اسی ذریعہ سے علم حاصل کیا جائے گا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کے دور میں اس کے ذرائع اور تھے، وہ براہ راست نبی ﷺ سے اور دوسرے صحابہ سے علم حاصل کر لیا کرتے تھے جبکہ آج کل کے دور میں اس کے ذرائع اور ہیں، دینی علم حاصل کرنے کا ایک ذریعہ درس نظامی کی تعلیم حاصل کرنا ہے۔ لہٰذا اب معلوم ہوا کہ درس نظامی کرنا بدعت نہیں ہے بلکہ علم حاصل کرنے کا ذریعہ

ہونے کی وجہ سے مستحسن اور اچھا کام ہے۔

تصوف میں مجاہدات و ریاضات کا بعینہ یہی معاملہ ہے کہ مجاہدات اور ریاضات نفس کی اصلاح کے ذرائع ہیں اور اصلاح فرض عین ہے۔ نیز یہ مجاہدات رہبانیت نہیں ہیں۔ مجاہدہ اور رہبانیت میں ایک فرق تو یہ ہے رہبانیت میں ثواب سمجھا جاتا ہے جبکہ مجاہدہ میں ثواب نہیں سمجھا جاتا۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ رہبانیت میں رہبانیت والے اعمال کو مقصود اصلی سمجھا جاتا ہے اور تا عمر رہبانیت جاری رکھی جاتی ہے جبکہ ہم لوگ مجاہدہ کو مقصود اصلی نہیں بلکہ مقصود اصلی کے حصول کا محض ایک ذریعہ سمجھتے ہیں نیز مجاہدہ ہمیشہ کے لئے نہیں ہوتا بلکہ صرف مقصود کے حاصل ہونے تک ہوتا ہے، اس کے بعد مجاہدہ ختم کر دیا جاتا ہے۔ اس وجہ سے جو مجاہدات تصوف میں کرائے جاتے ہیں یہ تحدیث فی الدین نہیں بلکہ تحدیث للدین کے زمرے میں آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو سمجھ کی توفیق عطا فرما دے۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

مختصرات سلوک

مقاماتِ سلوک کا حصول کیسے ممکن ہے؟

گزشتہ کتابچوں میں یہ بات اجمالاً ذکر کی گئی ہے کہ سلوک کی تکمیل کے لئے مقاماتِ سلوک کو تفصیل سے طے کرنا ضروری ہے۔ موجودہ تحریر میں ہم یہ جانیں گے کہ مقاماتِ سلوک کو کیسے حاصل کیا جاسکتا ہے۔

تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ لطائفِ ثلاثہ (قلب، عقل اور نفس) قرآن و سنت سے ثابت ہیں اور ان کی اصلاح کرنا بھی قرآن و سنت سے ثابت ہے۔

فرمایا گیا ہے کہ آخرت پر یقین عقل کا شعبہ ہے۔ جس کو آخرت کا یقین حاصل ہو گیا اور وہ آخرت کے لیے کام کرنے پر کمر بستہ ہو گیا، اس کی عقل کی اصلاح ہو گئی۔

قرآن مجید میں عقل مند لوگوں کی صفات میں سے ایک صفت یہ بتائی گئی ہے کہ "عقلمند لوگ وہ ہیں جو اٹھتے، بیٹھتے اور لیٹتے اللہ پاک کو یاد کرتے ہیں"۔ فرمایا:

﴿إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ ۝١٩٠ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ﴾ (آل عمران: 190-191)

ترجمہ: "بیشک آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور رات دن کے بارے بارے آنے جانے میں ان عقل والوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔ جو اٹھتے بیٹھتے اور لیٹے ہوئے (ہر حال میں) اللہ کو یاد کرتے ہیں"۔

اس نصِ قرآنی سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر دائمی یادِ الٰہی حاصل ہو جائے تو عقل کی اصلاح ہو جاتی ہے۔ اللہ پاک کی دائمی یاد ذکر کے ذریعے حاصل ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے سورۃ الشّمس کی آیت نمبر 9 میں نفس کی اصلاح کے بارے میں بتایا ہے۔ فرمایا:

﴿قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا﴾ (الشمس: 9)

ترجمہ: "فلاح اسے ملے گی جو اس نفس کو پاکیزہ بنائے"۔

نفس کی اصلاح نفس کا تزکیہ کرنے سے ہوتی ہے اور نفس کا تزکیہ مجاہدہ سے ہوتا ہے۔

قلب کے متعلق احادیث مبارکہ میں آتا ہے کہ "دلوں کو زنگ لگ جاتا ہے اور اس کو صاف کرنے کا آلہ اللہ کا ذکر ہے"۔

قلب پر دونوں چیزوں کا اثر ہوتا ہے، فجور کا بھی اور تقویٰ کا بھی۔ جیسا کہ احادیث شریفہ میں اس کی صراحت ہے۔ ایک حدیث میں نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "تقویٰ یہاں ہے" اور دل کی طرف اشارہ فرمایا۔ جبکہ ایک حدیث شریف میں یہ بھی آیا ہے: "جب کوئی آدمی گناہ کرے اور توبہ نہ کرے تو اس کے قلب پر سیاہ داغ لگ جاتا ہے"۔

ان احادیث مبارکہ کی تصریحات سے یہ بات بخوبی ثابت ہو جاتی ہے کہ قلب پر دونوں چیزوں (فجور اور تقویٰ) کا اثر ہوتا ہے۔ لہٰذا قرآن و حدیث سے ثابت ہوا کہ ذکر اللہ اور مجاہدات کے امتزاج سے تینوں لطائف کی تہذیب ہوتی ہے۔

لطائفِ ثلاثہ کی تہذیب سے لطیفۂ روح اور لطیفۂ سرِ وجود میں آتے ہیں۔ جب عقل کی تہذیب ہوتی ہے تو لطیفۂ سر وجود میں آتا ہے، جب قلب کی اصلاح ہوتی ہے تو لطیفۂ روح وجود میں آتا ہے اور جب نفس کے رذائل کی تہذیب ہوتی ہے تو اخلاقِ حمیدہ وجود میں آتے ہیں۔ اخلاقِ حمیدہ کا وجود میں آنا ہی اخلاقِ ذمیمہ کا ختم ہونا ہے اور یہی اصل مقصود ہے کہ اخلاقِ ذمیمہ ختم ہو جائیں اور اخلاقِ حمیدہ حاصل ہو جائیں۔ انہی اخلاقِ ذمیمہ کے خاتمے اور اخلاقِ حمیدہ کے حصول سے مقامات وجود میں آتے ہیں۔

مثلاً حرص ایک رذیلہ ہے، جب یہ ختم ہوتا ہے تو اس کی جگہ قناعت وجود میں آتی ہے اور سالک کو مقامِ قناعت حاصل ہو جاتا ہے، گویا مقامِ قناعت در اصل حرص کے ختم ہونے پر منحصر ہے۔ ان تمام اخلاقِ ذمیمہ کی جڑ نفس میں ہوتی ہے، ان کے خاتمے سے اخلاقِ حمیدہ وجود میں آتے ہیں جن کو مقامات کہتے ہیں، مقام کے حصول اور ترقی سے تقویٰ حاصل ہوتا ہے اور قلب میں قرار پکڑتا ہے۔

جب سالک اپنے اندر موجود رذائل کو دباتا ہے تو اس سے تقویٰ پیدا ہوتا ہے اور دل میں جا کر جگہ پکڑتا ہے۔ تقویٰ پیدا تو نفس میں ہوتا ہے لیکن بعد میں اس کی جگہ قلب بنتا ہے۔

پس اگر مرید کی نظر رذائل پر ہو اور وہ ہمہ وقت ان کی تہذیب میں مشغول ہو، تو اسے مقامات حاصل ہوتے رہتے ہیں۔ جب مقامات کا حصول شروع ہوتا ہے تو

قلبی کیفیات میں تبدیلی آتی ہے، جس سے شیخ کو اس کے احوال کا پتا چلتا ہے اور اسے تربیت میں آسانی ہوتی ہے۔ وہ ان احوال اور کیفیات کو سامنے رکھ کر مرید کی مزید تربیت کرتا ہے۔

مقاماتِ سلوک طے کرنے کے اس سفر کو "سلوک طے کرنا" بھی کہا جاتا ہے اور "سیر الی اللہ" بھی کہا جاتا ہے۔ نام کوئی بھی ہو مگر طریقہ یہی ہے کہ تینوں لطائف کی اصلاح و تہذیب کی جائے اور مقامات سلوک طے کیے جائیں۔

"مقاماتِ سلوک" میں لفظ "مقام" سے بعض سالکین کو ایک دھوکہ ہو جاتا ہے، جب وہ اپنے اندر کسی رذیلہ کی کچھ نہ کچھ اصلاح پاتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ ہمیں یہ مقام حاصل ہو گیا۔ یہ ایک دھوکہ ہے اس سے بچنا ضروری ہے۔ سالک کی نظر اس پر نہیں ہونی چاہیے کہ مجھے کون سا مقام حاصل ہو گیا ہے بلکہ اس کی نظر ہمیشہ اس چیز پر رہنی چاہیے کہ میرے اندر کتنی خرابی باقی ہے۔

در اصل "مقام" کا لفظ دو موقعوں پر استعمال ہو سکتا ہے۔

ایک یہ کہ کسی کو کوئی مرتبہ حاصل ہو جائے تو کہا جاتا ہے کہ فلاں اس مقام و مرتبہ کا حامل ہے، فلاں کا مقام بہت اونچا ہے۔ جیسے کہتے ہیں کہ فلاں کا مقام بہت اونچا ہے۔

جبکہ تصوف کی اصطلاح میں "مقام" سے مراد یہ ہے کہ کس رذیلے کی کتنی اصلاح ہو گئی ہے۔ جب کسی رذیلہ کی اصلاح مکمل طور پہ ہو جاتی ہے تب اس کی جگہ ایک صفتِ حمیدہ آتی ہے، اسے "مقام" کہتے ہیں۔ مثلاً "مقامِ قناعت" در اصل حرص کے خاتمے کے بعد حاصل ہونے والی صفت کا نام ہے۔ حرص ایک رذیلہ ہے، اسے ام الامراض بھی کہا جاتا ہے۔ جب سالک کے اس رذیلے کی مکمل اصلاح ہو جاتی ہے تو حرص ختم ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ قناعت آ جاتی ہے۔ پھر جب اس قناعت میں رسوخ پیدا ہو جاتا ہے تب ہم کہتے ہیں کہ مقامِ قناعت حاصل ہو گیا۔

بالفاظ دیگر یوں کہا جا سکتا ہے کہ دیکھا جائے گا کہ سالک کے کتنے رذائل دور ہوئے ہیں، اس سے پتا چلتا ہے کہ وہ کس مقام پر کھڑا ہے۔

اب اگر سالک کی نظر رذیلے کے خاتمے پر مرکوز ہو تو وہ اپنے مرتبے کو خیال میں نہیں لائے گا بلکہ اپنی توجہ صرف رذیلہ کے خاتمے پر رکھے گا۔ مثلاً ایک سالک

کے اندر سے حرص کا رذیلہ نصف حد تک ختم ہو گیا تو اب وہ یہ نہیں دیکھے گا کہ اس کا نصف رذیلہ ختم ہونے کی وجہ سے اس کا مرتبہ بلند ہو گیا ہے بلکہ وہ یہ سوچے گا کہ ابھی اس کا رذیلہ نصف حد تک باقی ہے، لہٰذا اس کا مقام ابھی بہت کم تر ہے۔ البتہ اس کا شیخ اس کے اس مقام کا ادراک ضرور کرے گا۔ جیسے بیمار شخص کی نظر بیماری پر ہوتی ہے لیکن ڈاکٹر یہ بھی دیکھتا ہے کہ اس کو کتنی صحت حاصل ہو گئی ہے۔

اگر سالک ان باتوں کو ذہن میں رکھے گا تو ان شاء اللہ اسے کسی مقام و مرتبہ کا حامل سمجھنے کا مرض لاحق نہیں ہو گا۔ اگر ہو گا تو اس سے نجات مل جائے گی۔ان شاء اللہ۔

شیخ کو اپنے مرید کے مقامات کے بارے میں مختلف طریقوں سے پتا چلتا ہے۔ صاحبِ کشف حضرات کو کشف سے پتا چل جاتا ہے، جو صاحبِ کشف نہ ہوں انہیں بصیرت و فراست اور مرید کے احوال و کیفیات کا تجزیہ کرنے سے اس کے رذائل اور ان کے آثار کا پتا بخوبی چل جاتا ہے۔ شیخ کے ساتھ اللہ کی تائید ہوتی ہے اس لئے اگر مرید با قاعدہ اپنے احوال کی اطلاع دیتا ہے اور شیخ کے ساتھ رابطہ رکھتا ہے، تو شیخ کو اس کے روحانی مقامات کا اندازہ ہوتا رہتا ہے۔

وَ اٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝

خانقاہ رحمکاریہ امدادیہ کے شب و روز

الحمد للہ خانقاہ رحمکاریہ امدادیہ میں حضرت سید شبیر احمد کاکاخیل صاحب دامت برکاتہم کے دروس و خطبات کا سلسلہ نہایت پابندی کے ساتھ جاری و ساری ہے جس سے طالبانِ حق مسلسل سیراب ہو رہے ہیں۔ دروس کی تفصیل درج ذیل ہے:

روزانہ کے بیانات اور معمولات

1۔ **"درسِ قرآن پاک"**

2۔ **"مطالعہ سیرت بصورتِ سوال"**

3۔ درس **"ریاض الصالحین"**

خانقاہ رحمکاریہ امدادیہ میں روزانہ فجر کی نماز کے بعد حضرت سید شبیر احمد صاحب کاکاخیل دامت برکاتہم کی طرف سے قرآن پاک کا درس دیا جاتا ہے، اس کے متصل بعد مطالعہ سیرت بصورت سوال کے عنوان سے سیرت سے متعلق ایک سوال کا جواب دیا جاتا ہے اور اسکے بعد ریاض الصالحین سے ایک حدیث شریف کی تعلیم ہوتی ہے۔

3۔ ٹیلی فون پر بات:

روزانہ 2 سے 3 بجے تک کا وقت (سوائے جمعہ کے) حضرت شاہ صاحب دامت برکاتہم سے ٹیلی فون پر بات کرنے کے لیے مختص ہے۔

ہفتہ وار ہونے والے بیانات و معمولات:

جمعہ:

ہر جمعہ حضرت شاہ صاحب کسی ایک مسجد میں جمعہ کا خطاب فرماتے ہیں۔

بعد نمازِ عصر ختم قرآن، مجلس درود شریف اور اس کے بعد جمعہ کی آخری گھڑیوں میں دعا کی جاتی ہے جو کہ آن لائن نشر بھی کی جاتی ہے۔

ہفتہ:

ہر ہفتہ کے دن نمازِ عصر کے بعد سے اتوار کی صبح اشراق کی نماز تک مرد حضرات کے لئے اصلاحی جوڑ ہوتا ہے جس میں درج ذیل معمولات کیے جاتے ہیں۔

عصر کی نماز کے بعد انفرادی ذکر۔

بعد نماز مغرب حضرت مولانا اشرف سلیمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب **"سلوکِ سلیمانی"** اور حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب **"تربیت السالک"** کا درس، اس کے بعد اجتماعی ذکر و دعا۔

بعد نماز عشاء ختمِ خواجگان، درود شریف کی مجلس۔

حضرت مولانا ڈاکٹر عبد الحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب **"اسوۂ رسولِ اکرم ﷺ"** سے تعلیم، کھانے پینے اور سونے کے آداب کا مذاکرہ۔

اتوار:

11 سے 12 بجے تک خواتین کے لیے خانقاہ میں شرعی پردے کے اہتمام کے ساتھ اصلاحی بیان۔

آج کے اس دورِ پر فتن میں جہاں مسلمانوں کو بہت سے مصائب کا سامنا ہے۔وہاں ایک بہت بڑا چیلنج اپنے بچوں کی اچھی ظاہری اور باطنی تربیت بھی ہے۔ آج ہمارے بچے انٹرنیٹ، موبائل اور سوشل میڈیا کی گندی ثقافتی یلغار کی زد میں ہیں اور اعمال کے ساتھ ساتھ اب ایمان بچانا بھی مشکل نظر آتا ہے۔

موجودہ دور کے چیلنجز اور تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے بچوں کی بہترین ظاہری اور باطنی تربیت کے لیے خانقاہ رحمکاریہ امدادیہ کی جانب سے ہفتہ وار آن لائن تربیتی پروگرام کا انعقاد کیا گیا ہے۔ ہر اتوار کو اس کے لیے زوم کا استعمال کرتے ہوئے لائیو کلاس منعقد کی جاتی ہے جو کہ بعد میں تربیتی پروگرام کے یوٹیوب چینل پر بھی اپلوڈ کر دی جاتی ہے۔

اس تربیتی پروگرام کو تین سیشنز میں تقسیم کیا گیا ہے۔

پہلا سیشن 1 سے 9 سال کے بچوں کے لیے ہوتا ہے جس میں دلچسپ کہانیوں کے ذریعے بچوں میں بہترین دینی اور دنیاوی اقدار و اخلاق پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اور ساتھ ساتھ ارکان اسلام کے بنیادی مسائل سے بھی آگاہ کیا جاتا ہے۔

دوسرا سیشن 10 سے 14 سال کے بچوں کے لیے ہوتا ہے جس میں بچوں میں اچھی عادات اور ذکر و تسبیحات کی تلقین کے ساتھ ساتھ قصص الانبیاء میں سے کچھ واقعات اور ان سے حاصل ہونے والے مفید اسباق بتائے جاتے ہیں۔

تیسرا سیشن 15 سال اور اس سے بڑے بچوں کے لیے ہوتا ہے جس کے اندر بچوں میں اپنی اصلاح کی فکر پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ ان کو قرب الٰہی حاصل کرنے کے طریقے اور مواقع بھی سکھائے اور بتائے جاتے ہیں اور آج کے دور کے تازہ فتنوں کے بارے میں آگاہی اور ان سے بچنے کی تربیت بھی کرائی جاتی ہے۔

جو خواتین و حضرات اپنے بچوں کی بہترین دینی اور دنیاوی تربیت کے خواہاں ہیں اور اس تربیتی پروگرام میں اپنے بچوں کو شامل کرانا چاہتے ہیں وہ مندرجہ ذیل وٹس ایپ گروپ میں شامل ہو جائیں۔ اس گروپ میں ان کو کلاس کا لنک اور تفصیلات بتا دی جائیں گی۔

گروپ میں شامل ہونے کے لئے اس نمبر پر بھی رابطہ کیا جا سکتا ہے

گوہر انوار صاحب کا نمبر- 03335383171

وٹس ایپ گروپ کا لنک:

https://chat.whatsapp.com/J3mkYpSOK9S72QxvGsYAG2

بعد نمازِ مغرب فرض عین علم کی تعلیم۔

رات آٹھ بجے انگریزی میں بیان۔

پیر:

بعد نمازِ عصر پشتو میں بیان۔ اللہ جل شانہٗ کے غضب اور عذابات (مثلاً مہنگائی، سیلاب اور وبائی امراض وغیرہ) کا سبب بننے والے معاشرتی گناہ (جھوٹ، رشوت، سود، اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا نہ ہونا) کی اصلاح پر خصوصی پشتو بیانات کا سلسلہ اس ماہ میں مکمل ہوا۔

بعد نماز مغرب اپنی اصلاح و تربیت کے متعلق (بذریعہ واٹس ایپ، ای میل اور ٹیلی فون پر موصول ہونے والے) سوالات کے جوابات۔

منگل:

بعد نمازِ مغرب درس مثنوی شریف۔

بدھ:

بعد نمازِ مغرب درس مکتوبات شریفہ حضرت شیخ مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ۔

جمعرات:

بعد نمازِ مغرب علامہ شبلی نعمانی اور حضرت سید سلیمان ندوی رحمہا اللہ کی کتاب "سیرت النبی ﷺ" کا درس اور درود شریف کی مجلس۔

ماہانہ بنیادوں پر ہونے والے بیانات و معمولات:

ہر مہینے میں ایک اتوار کو خواتین کے لیے شرعی پردے کے اہتمام کے ساتھ دن 9 سے 12 تک اصلاحی جوڑ۔ اس سلسلے میں 16 اکتوبر بروز اتوار خانقاہ میں خواتین کا اصلاحی و تربیتی جوڑ منعقد ہوا۔ موضوعات: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں دونوں جہانوں کی کامیابی ہے۔ حبِ الٰہی میں اتباعِ رسول کی اور اتباعِ رسول میں صحابہ کی پیروی کی اہمیت۔ فہم التصوف۔

مہینے میں ایک بار ہفتہ عصر سے اتوار عصر تک خانقاہ امدادیہ جہانگیرہ (صوابی) میں اصلاحی جوڑ۔

ہر مہینے کے پہلے جمعہ کو راولپنڈی اسلام آباد میں کاکاخیل حضرات کے لیے مغرب تا عشاء جوڑ ہوتا ہے جس میں کاکا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیمات کا کتاب "**مقاماتِ قطبیہ و مقالاتِ قدسیہ**" سے درس ہوتا ہے۔

ہر مہینے میں ایک دفعہ رفاہ یونیورسٹی میں ایک بیان ہوتا ہے جو آن لائن بھی نشر کیا جاتا ہے۔

نوٹ:

گذشتہ سالوں کی طرح اس مرتبہ بھی ربیع الاول کے شروع ہوتے ساتھ سلسلے

میں خصوصی طور پر اہتمام کے ساتھ درود شریف پڑھنے کا آغاز ہوا۔الحمد للہ، اس ماہِ ربیع الاول میں سلسلے کے مرد و خواتین کی طرف سے پڑھے گئے درود شریف کی تعداد 32 کروڑ 24 لاکھ سے زیادہ تھی۔ نیز آپ صلی اللہ علیہ و سلم کیلئے 36 مرتبہ ختمِ قرآن، سورہ یس شریف 751 مرتبہ، سورہ ملک 808 مرتبہ، نوافل 2102 مرتبہ، صلاۃ التسبیح 138 مرتبہ، کلمہ طیبہ 51000 مرتبہ، کلمہ تمجید 107500 مرتبہ، استغفار 102000 مرتبہ، روزے 11، سورہ اخلاص 1000 مرتبہ اور سورہ کہف 6 مرتبہ۔ سال 2014 میں جب درود شریف کا اجتماعی سلسلہ شروع ہوا تھا تو الحمد للہ ایک کروڑ بار درود شریف پڑھا گیا تھا، جو اگلی مرتبہ 2 کروڑ مرتبہ، پھر تیسرے سال 4 کروڑ مرتبہ، پھر 14 کروڑ 25 لاکھ مرتبہ، پھر 30 کروڑ 37 لاکھ مرتبہ اور سب سے زیادہ 2019 میں 63 کروڑ مرتبہ درود شریف پڑھا گیا، پھر سال 2020 میں 25 کروڑ اور گذشتہ سال 2021 میں 47 کروڑ 23 لاکھ درود شریف پڑھا گیا۔ اس طرح مجموعی طور پر صرف ربیع الاول کے مہینے میں پڑھے گئے درود شریف کی تعداد 2 ارب 19 کروڑ 9 لاکھ سے زیادہ ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی ذٰلِک۔

7 اکتوبر بروز جمعہ کو نیلور میں حضرت عبدالرشید خٹک صاحب کی رہائش گاہ پر خواتین کیلئے خصوصی اصلاحی بیان ہوا۔ موضوع: محبت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے کرنا اور عملی زندگی میں سنت کو لانا۔

8 اکتوبر 2022 بروز ہفتہ ادارۃ العلوم العصریہ جہانگیرہ کے طلبا، اساتذہ اور منتظمین خانقاہ تشریف لائے اور 5 طلبا نے مختلف موضوعات پر اپنی اپنی پریزینٹیشن پیش کیں، پریزینٹیشن کے بعد ادارے کے منتظم جناب ڈاکٹر عرفان صاحب نے حضرت شاہ صاحب دامت برکاتھم سے پریزینٹیشن کے تناظر میں طلبا و اساتذہ کی کارکردگی اور محنت کے بارے میں پوچھا تو حضرت نے ارشاد فرمایا: اِس دور کے اندر خیر کیلئے جتنا بھی کام کیا جائے وہ کم ہے اگرچہ آپ اپنا دل بڑا کرنے کیلئے اس پہ اچھا کمنٹ دیں گے لیکن وہ پھر بھی کم ہوگا کیونکہ اس وقت ہر چیز کی ضرورت بہت زیادہ ہے۔ یعنی اس میں انسان کبھی بھی مطمئن نہیں ہوسکتا، کیونکہ انسان کے سامنے اگر پورا ایک ٹارگٹ ہو اور اس کے لئے انسان کوشش کر رہا ہو تو جتنا جتنا وہ آگے چل رہا

ہے وہ تو ما شاء اللہ صحیح ہے لیکن صحیح بات میں عرض کرتا ہوں کہ ابھی آگے بڑھنے کے بڑے رستے ہیں۔

14 اکتوبر بروز جمعہ کو حضرت شاہ صاحب دامت برکاتھم جہانگیرہ مسجد میں جمعہ کے بیان کے لیے تشریف لے گئے۔ جمعہ کے بیان کے بعد ادارۃ العلوم العصریہ کے طلبا کو میراث کا لیکچر دیا جس میں میراث کی ضرورت و اہمیت اور اسے سیکھنے کے جدید اور آسان طریقے کا تعارف کروایا۔

16 اکتوبر بروز اتوار بعد از مغرب ریلوے جنرل ہسپتال کی الکوثر مسجد میں خصوصی اصلاحی بیان ہوا۔بیان کا موضوع تھا۔ قرآن و سنت کو سمجھنے اور اس پر چلنے کیلئے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی پیروی ہی میں نجات ہے۔

بزرگوں کی تحریریں کیوں پڑھنی چاہئیں؟

بزرگوں کی تحریریں اُن کی زندگی کا نچوڑ ہوتی ہیں۔ ہم ہزاروں تجربات کرکے جس چیز تک نہیں پہنچ سکتے ان کی تحریروں سے ہم اُن چیزوں تک آناً فاناً پہنچ سکتے ہیں۔ اس وجہ سے بزرگوں کی ان تحریروں میں ریسرچ کرنا جس سے ہمارا یہ مقصد حاصل ہوتا ہو بہت مفید ہے۔ پھر ان میں مجددین حضرات کا رنگ بالکل الگ ہوتا ہے کیونکہ مجددین حضرات کی تحقیقات عمومی دین کے لئے ہوتی ہیں جو کہ اس وقت کے لوگوں کی سطح کے مطابق پیدا شدہ فروگزاشتوں کو دور کرکے دین کو اصلی صورت میں ظاہر کرتے ہیں۔

اگر صرف ایک آخری مجدد کی اتباع کی جائے تو وہ بھی کافی ہوتی ہے لیکن اگر چند متواتر مجددین کی کتابوں کا مطالعہ کیا جائے تو اس سے حالات کے مطابق مطلوبہ تبدیلی لانے کا فن آشکارہ ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس کے بعد اگر کوئی تبدیلی آتی ہے تو اس کے لئے "by the process of extrapolation" حل ڈھونڈنا آسان ہو جاتا ہے۔

اس کتاب میں ہم نے اپنے ان اکابر کے فیوضات کو جمع کرنے کی کوشش کی ہے جو کہ قلب، عقل اور نفس کی اصلاح کے متعلق راہنمائی میں ایک اعلیٰ مقام رکھتے تھے۔ حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے قلبی اعمال بہت اونچے تھے جو کہ قلبی واردات والے حضرات کی راہنمائی کرتے ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے عقلی اعمال بہت زیادہ اونچے تھے۔ اس وجہ سے حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی تحریرات کا فائدہ اُن لوگوں کو زیادہ ہوتا ہے جن کی عقلیں بہت آگے کا سوچتی ہیں۔ حضرت کاکا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے صفائی نفس کے اعمال بہت اعلیٰ تھے اس وجہ سے حضرت کی تعلیمات نفس کی صفائی کے کاموں میں مشعلِ راہ ہیں۔ حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیمات آج کل کے منطقی موشگافیوں کے جوابات کے لئے ماحول بنانے اور صلاحیت پیدا کرنے کے لئے مفید ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے اکابر کی تعلیمات سے پورا پورا مستفید ہونے کی توفیق عطاء فرمائے۔ آمین

051 5470582 0332 5289274

sshabirkakakhel@gmail.com,
sshabir@tazkia.org

حضرت شاہ صاحب مدظلہ کو سوالات بھیجنے کیلئے 0315 5195788

www.tazkia.org